ایک سانولا

گوروں کے دیس میں

(سفرنامہ اور سفر خامہ)

عرش تیموری

★

جاوید پبلشرز
لیاقت آباد۔ کراچی ۱۹

(سفرنامہ اور سفرخامہ)

عرش تیموری

★

جاوید پبلشرز
لیاقت آباد۔ کراچی ۱۹

طبع اوّل ____ ۱۹۶۲ء
تعداد طبع ____ ایک ہزار
قیمت ____ ۲ روپے
طباعت ____ انٹرنیشنل پریس کراچی

ترتیب

سفرنامہ

سفرِ خام

آغازِ سفر

حضرت عرش تیموری کا سفرنامہ نہ صرف اسی لئے دلچسپ ہے کہ ہمارے ادب میں ادبی سفرناموں کی بڑی کمی ہے بلکہ اس لئے بھی اہم ہے کہ اس میں موصوف کی دلکش انفرادیت جلوہ نما ہے۔ ان کی نظر دُنیا کی ہر چیز پر ایک خاص انداز سے پڑتی ہے اور اس چیز سے مزاحیہ عناصر کو اپنی طبع کے مطابق اخذ کر لیتی ہے۔ اسی میں ان کی ہر تصنیف کی دلکشی کا راز پوشیدہ ہے اور اسی نے ان کے سفرنامہ کو اب تک کے تمام سفرناموں سے ممتاز کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان کا سفر بذریعہ طیارہ ہوا اور وہ جس دُنیا پر سے گزرے اس پر انھوں نے طائرانہ نظر ڈالی۔ مگر ان کا طائر تخیل اپنی مخصوص پرواز ہی سے ان مقامات پر اُترتا رہا جہاں وہ طیارے سے اُتر کر کچھ عرصے کے لئے ٹھہرے۔ اس سلسلے میں ایشیا، یورپ اور امریکہ کے معروف شہروں اور اس کے اندر کے معروف مقامات پر ان کی طائرانہ نظر پڑی اور جس مخصوص دلچسپی سے انھوں نے ان کو دیکھا اس کو رقم کر دیا۔ اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا ایک عجیب مجموعہ بن گیا جس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عام سفرناموں کی طرح ان مقامات کی گائڈ ہرگز نہیں ہے بلکہ مصنف کی ان مقامات سے دلچسپی کی گائڈ ہے۔ چٹکلے عجیب کردار کے تاثرات، رسوم کے تعجب انگیز پہلو، مناظر کے چمک دار عکس اور ان سب کے پس منظر میں خود تیموری صاحب کی روح رواں اس تصنیف کو نہایت دلکش بناتی ہے۔ تیموری صاحب بہر حال اپنے ماحول کے فرد ہیں اور بنیادی طور پر مزاح نگار کی فطرت لے کر پیدا ہوئے ہیں غیر ماحول کی غیریت میں انھیں عجیب عجیب مضحک پہلو دکھائی دیتے ہیں اور وہ ان کو اُجاگر کرتے چلے جاتے ہیں اور چلے آتے ہیں۔ "ایک سالو لاگروں کے دیس میں" بہت کچھ ان کے ڈرامائی سفر کے بنیادی تضاد کو سامنے لے آتا ہے۔ "جمیلان سے ملاقات" کی سُرخی سے اُمید ہوتی ہے کہ کچھ صاحب جمال لڑکیاں دکھائی دیں گی مگر بڑی ہنسی آتی ہے جب کہ جمیلان کا مطلب "دو جمیل صاحبان" ہیں جو پی آئی اے کے ملازم ہیں۔ "فردوسی کی دکان" بھی اسی قسم کے لطیف

مزاح کی آئینہ دار ہے چنانچہ ہر سُرخی دعوتِ فکر دیتی ہے اور ہر ٹکڑا دل کو ایک نئے انداز سے گُدگدا دیتا ہے۔ "جنازہ کمپنی کی مُبارک باد" شاید سب سے زیادہ باثر ٹکڑا ہے۔ اس میں ایک نیا تعجب انگیز انکشاف بھی ہے اور پھر جنازہ ایسی المیہ چیز کے ساتھ جو مضحک صورتیں وابستہ دکھائی گئی ہیں ان میں تیموری صاحب کی مزاحیہ نظر اپنا سب سے زیادہ زوردار کھیل دکھاتی ہے۔

اس مجموعے میں "سفرنامہ" کے ساتھ "سفر خلد" بھی شامل ہے اور اسی قسم کا ایک ٹکڑا "پیر ہندی کے نام ایک خط" اور دوسرا ٹکڑا "ٹانگ اڑانے کا فن" بھی نظر آئیں گے۔ ان کو ادبی تنقید کے دائرے میں لایا جائے گا۔ مگر ان میں وہ ادبی تنقید نہیں جو ہمارے منشیانِ تنقید کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ مضامین تخلیقی تنقید میں ایک اہم اضافہ ہے۔ "چالو ادب" بڑے پُر لطف طریقہ پر اس رائج الوقت ادب کی دھجیاں اُڑاتا ہے جس کی پُکار ہمیں ہر طرف سے سُنائی دیتی ہے۔ "پیر ہندی کے نام" اقبال کو ایک نئے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ دوسرے مضامین زندگی سے زیادہ اور ادب سے کم تعلق رکھتے ہیں مگر مصنف کا ادبی نظریہ بھی پیش پیش نظر آتا ہے۔ "اے میری ڈائری" رومانیت اور جنسیت کو بڑے لطیف طریقہ پر مضحک ثابت کرتا ہے۔

غرض تیموری صاحب اپنی اسی تصنیف سے اُردو ادب میں ایک قابلِ توجہ اضافہ کر رہے ہیں جس کی طرف خود ان کی اور ان کے پڑھنے والوں کی مخصوص توجہ سے ایک نئی انفرادی نظر اور ایک نئے طرزِ مزاح کا رنگ پختہ ہو کر دائمی چمک حاصل کرے گا۔

(ڈاکٹر) محمد احسن فاروقی
(کراچی ۱۸ ستمبر ۱۹۶۲ء)

ہوا بازی کا موجد وہ شخص تھا جس نے دنیا میں سب سے پہلے ہوائی اُڑائی خدا جانے لوگوں کو یہ ہوائی اُڑانیوالا کیوں اتنی بار معلوم ہوا کہ اس کے بعد جب کبھی ہوائی اڑی تو لوگ بیساختہ کہہ اُٹھے،

"یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی"

آج سینکڑوں سال بعد وہی ہوائی "پر پرزے" نکال کر ہوائی جہاز بن گئی ہے، اور ہوائی اڑانیوالا دشمن جنس بدل کر دوست کا روپ اختیار کر چکا ہے۔ اب

انسانیت کے دوست ہوائی جہاز اڑا رہے ہیں اور چاند کی دنیا میں پہنچنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

پاکستان انٹرنیشنل ائرلائنز نے امریکہ سے بوئنگ ۷۲۰۔بی کی خریداری کے سلسلے میں استقبالی سفر کی دعوت دی تو اس دعوت کو فوراً قبول کرنے میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ چاند کے سفر کی ابھی سے تھوڑی بہت مشق ہو جائے۔

۲۲ر دسمبر کی صبح ۷ بجے کراچی کے ہوائی اڈے پر پہنچے اور اس عالیشان ایوان میں داخل ہوئے جہاں دونوں طرف ہوائی کمپنیوں کے کابک بنے ہوئے ہیں پورے ایوان میں جگہ جگہ انسان بھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہاں کوئی "بین الاقوامی مقابلہ اجسام" ہو رہا ہے۔ ہوائی کمپنیوں کے ہرکارے اپنے اپنے کابکوں میں "درشن" کی رسم ادا کر رہے تھے۔ ان کابکوں کے آگے انسانوں کی ٹیڑھی ترچھی قطاریں تھیں۔ مجھے اپنی قوم کی "خمیدگی" کا احساس ہوا مگر اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ مٹی ذرا نم ہو تو خم ہو سکتی ہے۔ ان قطاروں سے ذرا ہٹ کر ایک ایرانی خاندان ہلال کی شکل میں مصروف گفتگو تھا۔ ان کے سامان میں ایک طوطے کا پنجرہ بھی تھا۔ جس میں طوطے کی بجائے بندر بند تھا۔

یونان میں ایک شخص دن کے وقت لالٹین لئے انسان کی تلاش کرتا تھا۔ آج وہ زمانہ آیا کہ انسان، بندر کی تلاش میں دور دور کے سفر کرتا ہے، اور پھر بڑے فخر سے اپنے ملک میں ایک بندر درآمد کرتا ہے۔ محفل کی اس گرما گرمی سے ذرا دور ایک اور خاندان لندن کے ارادے میں ہے۔ اس خاندان کے زادِ سفر میں ایک بڑے میاں بھی ہیں۔ جو اب تنگ پاجامہ پہنے ہوئے ہیں ان بڑے میاں نے پاجامے کو ایسا کس کر اتنا اونچا باندھا ہے کہ ایک نظر میں ان کے فطری غصے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

جمیلاں سے ملاقات

مجھے پی آئی اے کے بوئنگ ۷۰۷ سے نیو یارک روانہ ہونا تھا۔ اس طیارے سے پہلے ایک اور طیارہ جا رہا تھا اس لئے ہمارا ہنگامی سفر بھی ہنگامہ بن گیا تھا۔ اس اثناء میں مجھے یاد آیا کہ پی آئی اے کے مسٹر جمیل نے ملاقات کی تاکید کی تھی۔ میں ہمارے صف شکن فاتحوں کی طرح قطاروں سے گزرتا جمیل صاحب کے پاس پہونچا اور "حاضر جناب" کی صدا لگائی۔ جمیل صاحب نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ان کے چہرے پر مچھلیوں کے تھوک بیوپاری کی اطمینان بخش مسکراہٹ

تھی۔ ان سے مل کر مجمع پر "نگاہ مکرر" کے سلسلے میں ٹہلنے لگا۔

ایک صاحب بہت گھبرائے ہوئے آئے اور خلیل صاحب سے کہنے لگے

"صاحب"! حد ہو گئی! عرش صاحب ابھی تک نہیں آئے!"

جب خلیل صاحب نے میری صورت دکھا کر تصدیق کر دی کہ وہ اس خاکسار کی تلاش میں ہیں تو وہ اور زیادہ گھبرا گئے لیکن جلد ہی مطمئن ہو گئے۔

"جناب کا اسم گرامی؟" میں نے دریافت کیا۔

"مجھے جمیل کہتے ہیں!" فرمایا۔

"پی آئی اے کے ایک اور جمیل صاحب سے بھی میں مل چکا ہوں تو گویا آپ بھی پی آئی اے میں ہیں؟"

"جن جمیل صاحب سے آپ ملے ہیں وہ آپ کے ساتھ جا رہے ہیں اور میں جمیل آپ کو خدا حافظ کہنے آیا ہوں!"

"پرسوں میں نے ٹیلیفون پر بہت افسردہ گفتگو کی تھی اور کل میں نے بہت خوش گفتاری سے کام لیا تھا ان دونوں موقعوں پر میں کن کن جمیل صاحبوں سے مخاطب تھا

"مجھے نیو یارک کے موسم کا حال کس نے بتایا؟ زرمبادلہ حاصل کرنے کے متعلق غلدات کس نے پیش کیں؟ گھر سے طیارہ گاہ لیجانے کی دھمکی کس نے دی۔؟"

"آخری خدمت کی پیش کش میں نے کی تھی!"

تماشہ

وہ پھر گھبرانے لگے اور مجھے بنگالی زبان کی کہانی "مکرجی" یاد آ گئی۔ ایک مکرجی ڈرامہ نویس کو جب اپنے ڈراموں سے آمدنی نہ ہوئی تو ایک کاروباری نے یہ نکتہ سمجھایا کہ آئندہ ڈرامہ پیش کرنے سے پہلے وہ کلکتے کی ٹیلیفون ڈائریکٹری حاصل کرے پھر تمام مکرجیوں کے پتے پر انھیں ڈرامے کا اشتہار روانہ کرے، ممکن ہے، کلکتے کے مکرجی ایک مکرجی کا ڈرامہ دیکھنا پسند کریں۔

ڈرامہ نویس مکرجی نے ایسا ہی کیا۔ اور پورا ہال مکرجیوں سے بھر گیا ابھی

ڈرامہ شروع نہیں ہوا تھا کہ ایک لڑکا بھاگتا ہوا آیا۔ اور تھیٹر کے منیجر سے کہا۔ میں مسٹر مکرجی کا پڑوسی ہوں، ان کے گھر میں آگ لگ گئی ہے۔ ان سے جلد ملوا دیجئے۔ وہ یہاں ڈرامہ دیکھنے آئے ہوئے ہیں۔

تھیٹر کے منیجر نے پورا نام پوچھنا چاہا مگر لڑکے کو پورا نام معلوم نہ تھا۔

"آپ مجھے ہال میں جانے دیں۔ میں انھیں پہچان لوں گا،" لڑکے نے بیتاب ہو کر کہا۔ منیجر کچھ پس و پیش کے بعد راضی ہو گیا۔ لڑکے نے ہال میں گھستے ہی چلا کر کہا۔ "مسٹر مکرجی آپ کے گھر میں آگ لگ گئی ہے!" یہ سنتے ہی سارے مکرجی گھبرا کر اٹھے اور بجلی کی طرح ہال سے نکل گئے۔ تھیٹر کا منیجر سیڑھیوں پہ کھڑا ہوا چلاتا رہا۔ "صاحب! یہ لڑکا جن مکرجی کا پڑوسی ہے، ان کے گھر میں آگ لگی ہے!" کسی نے اس کی نہ سنی اور ہال خالی ہو گیا۔

اس وقت صبح کے آٹھ بج چکے تھے اور ہمارے طیارے کی روانگی کا وقت ہو چکا تھا اس لئے میں نے طیارہ گاہ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور ایک بہت بڑے سفر کے لئے کمربستہ ہو گیا۔ ہمارا طیارہ فضا میں بلند ہوا تو کراچی کا عظیم شہر کسی آرٹسٹ کا نگینہ معلوم ہونے لگا۔ رنگوں کی یہ چھوٹی چھوٹی نہریں رواں دواں تھیں۔ کسی بہتر مرقع کا جزو بننے کے لئے؟

بہرحال یہ منظر بھی دیکھتے ہوئے بادلوں میں کھو گیا۔ میں نے اپنے ہم نشست پر نگاہ ڈالی جو غیر ملکی رسالوں میں گم تھے۔ جب قدرت کی حسین و جمیل کتاب

نگاہوں کے سامنے ہو تو مطالعہ چہ معنی دارد؟

بہرحال دنیا تو اضداد کا مجموعہ ہے۔ انسان نے بین بنائی تو کیا ہوا بھینس
کی نسل بھی چلتی رہی، وہی انسان جس نے بین بنائی تھی۔ بھینس کو ہری ہری گھاس
کھلاتا رہا۔ اتنے میں مجھے کسی کے غرانے کی آواز آئی۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا
تو معلوم ہوا کہ میرے ہم نشست جو ابھی ابھی رسالوں کے ذریعے علوم کے شہر فتح
کر رہے تھے، نیند کے ایک معمولی جھونکے سے پرانے درخت کی طرح گر پڑے
ہیں۔ ان کے نتھنے شہنائی بجانے والوں کے گالوں کی طرح پھول رہے تھے لیکن
ان سے بھینس کے ڈکرانے کی آواز نشر ہو رہی تھی، میں نے گھبرا کر دوسری نشستوں
کی طرف دیکھا تو ادھر دو صاحب اپنے گھر والوں کو خط لکھ رہے تھے جن سے جدا ہوئے
ابھی صرف آدھ گھنٹہ ہوا تھا۔ شاید مثنوی مولانا روم میں یہ قصہ پڑھا تھا کہ ایک
عاشق صادق کو اپنے محبوب سے تنہائی میں ملنے کا اتفاق ہو گیا اس اچانک
ملاقات سے پہلے ان عاشق صادق نے اپنے محبوب کو ایک خط لکھا تھا جس
میں ہجر کی رپورٹ کے علاوہ حسن کے عالمی خطرات کی تفصیل تھی۔ جب
ملاقات شروع ہوئی تو عاشق صادق نے اپنا طویل خط نکال کر محبوب کو
سنانا شروع کیا۔ کچھ دیر تک وہ حسینہ اس داستان امیر حمزہ کو سنتی رہی،
اور پھر کہا۔

"تمہیں مجھ سے محبت نہیں۔ اگر محبت ہوتی تو میرے جلوے میں گم ہو جاتے

اپنی تصنیف نہ سناتے!"

پھر کر عاشق صادق کو "اخراج البیت" کا حکم سنایا۔ ٹیلے میں بیٹھے
ہوئے ان دونوں حضرات کی بیگمات نے بھی ان کے خطوط کا مطالعہ کر کے
کہا ہو گا۔ "ہم نے اپنے سینے پر پتھر رکھ کر تمہیں دنیا دیکھنے کے لئے بھیجا
تھا اور تم نگاہیں نیچی کئے خط لکھتے رہے! افسوس!"

فردوسی کی دوکان

اب ہمارا طیارہ ایران کے دارالحکومت تہران پر اتر رہا تھا۔ ایران کی مشہور سرزمین ہماری ثقافت کی زمین رہی ہے۔ خیام، حافظ، سعدی، عراقی، جامی اور کتنے ہی ایرانیوں نے ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کو متاثر کیا ہے۔ جب ہم تہران پہونچے تو ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ہوا میں خنکی کا یہ عالم تھا کہ جسم کے کھلے حصے سن ہونے لگے تھے۔ ہم طیارہ گاہ کے ریستوران میں پہونچے تو دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی بائیں

جانب ایک شاندار دوکان تھی جس پر "فروش گاہ فردوسی" لکھا تھا۔ ہمارے دو تین ساتھی جو پوری زندگی میں ایک فردوسی سے متعارف تھے دوسرے فردوسی کو دیکھ کر حیران ہوئے۔ یہ حیرانی بڑھ کر ناگواری میں تبدیل ہونے لگی۔ کیونکہ فردوسی کے قابل تعظیم نام کے ساتھ فروش گاہ کا اضافہ کیا گیا تھا۔!

"بھائی!" میں نے عرض کیا۔ "آپ شاعر فردوسی کی توہین سے متاثر ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا۔ فردوسی کو شاہنامہ لکھنے پر خاطر خواہ انعام نہ ملا تو اس نے کہا۔"

خجستہ درگہ محمود غزنوی دریاست
چگونہ دریا کہ آنرا کنارہ پیدا نیست
چہ غوطہ ہا زدم واندرو ندیدم در
گناہ بخت من است ایں گناہ دریا نیست

محمود غزنوی کی درگاہ ایک سمندر ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا سمندر ہے جس کا کنارہ کہیں نہیں۔ اس سمندر میں کتنے ہی غوطے لگائے لیکن مجھے ایک بھی موتی نظر نہ آیا۔ یہ میری قسمت کا قصور ہے، سمندر کا نہیں!

اس حسرتناک "آمد" کے بعد فردوسی نے آمدنی بڑھانے کے لئے

یہاں دوکان کھول لی ہوگی۔ میرے ساتھی ہنسنے لگے۔

ہم آشند و روند کا جائزہ لیتے ہوئے ہال کی انتہا کے قریب ایک صوفے پر جا بیٹھے۔ یہاں بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے تھے جن سے ہمہ گیر نظارے کا موقع تھا۔ ایک طرف خدا حافظ کٹہرہ تھا۔ یہاں وہ لوگ کھڑے تھے جو مسافروں کا آخری دیدار کرتے ہیں۔ اس کٹہرے میں سب سے آگے سات آٹھ ایرانی لڑکیاں انگریزی لباس میں ملبوس کھڑی تھیں ان کی آنکھوں میں اب بھی ایران کی جھلک تھی ورنہ سطحی جائزے سے وہ ایرانی معلوم نہ ہوتی تھیں۔

یہ لڑکیاں اشاروں میں ایک صاحب سے باتیں کر رہی تھیں۔ جو ہمارے قریب ہی چاکلیٹی سوٹ اور سنہری فریم کی عینک لگائے بیٹھے تھے یہ صاحب اطالوی معلوم ہوتے تھے کیونکہ یہ اپنے دوست سے گفتگو کے دوران ٹرول کو ٹیترول کہہ رہے تھے۔

میں ابھی گم تھا کہ احمد علی خاں صاحب (پاکستان ٹائمز) میری محویت کا اندازہ کر کے خود ہی میرے لئے کاغذی گلاس میں کھولتی ہوئی کافی لے آئے۔ ان لڑکیوں کے اشارے اور ان اطالوی صاحب کے جواب ایک معنی خیز مسلسلہ معلوم ہوئے۔ اندازہ ہوا کہ یہ صاحب روم جا رہے ہیں شادی شدہ ہیں ان کا گھر ایک بچے کی کلکاریوں سے آباد ہونے والا ہے یہ لڑکیاں

اشارہ سے کہہ رہی تھیں کہ تم گھر جا کر اپنے بچے کو کھلاؤ گے اور تمہاری بیوی شان سے سیر کیا کرے گی۔

انہوں نے جواب میں اشارہ کیا کہ میں بچے کو یہیں لے آؤں گا تم سب اسے کھلاؤ گی اور میں شان سے سیر کروں گا۔ سب ہنسنے لگے۔ پھر ان اطالوی صاحب نے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا اور اپنے دوست کو بتایا کہ یہ لڑکی شعر کہتی ہے۔ یہ لڑکی اپنے بال قدرے بے ترتیبی سے بکھرائے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر سنگھار کی کاریگری بھی کم تھی۔ قدرت نے ہر لڑکی کو فن دیا ہے۔ اگر لڑکی فن ہضم کر لیتی ہے تو فن لطیف کی خدمت گزار بن جاتی ہے۔ اگر فن ہضم نہیں ہوتا تو گالوں پر غازہ اور لبوں پر سرخی بن کر رہ جاتا ہے۔ بہرحال دونوں لڑکیاں قابل ستائش ہیں۔ پہلی لڑکی اپنے فن کا سہارا لیکر آپ کا ہر زمانے اور ہر مقام پر تعاقب کرتی ہے اور دوسری لڑکی آپ کو اپنے تعاقب پر مجبور کرتی ہے۔ آپ دونوں صورتوں میں نہ "لطیف" لڑکی سے بچ سکتے ہیں اور نہ "سرخ" لڑکی سے۔

اب ہماری روانگی کا وقت ہو چکا تھا۔ بادلوں کی ادھاہٹ گہری ہو رہی تھی اور تہران کی مختلف رنگ عمارتوں پر سرمئی چادر پھیلتی جا رہی تھی۔

پیغمبروں کی سرزمین

ہمارا طیارہ عراق سے گذر کر شام کے علاقے کو طے کرتا ہوا بیروت
پہنچا۔ بحیرۂ روم کے ساحل پر لبنان کا دارالحکومت بیروت ایک دلکش
دل آویز شہر ہے۔ یہاں ہمارے طیارے نے نیچی پرواز کی۔ سمندر کی موجیں
پہاڑی ساحل سے ٹکرا کر روپہلے جھاگ کا حاشیہ بنا رہی تھیں۔ لبنان کی
سیاہی مائل اودی پہاڑیاں ہلکی ہلکی گھٹاؤں کو چھوتی ہوئی دکھائی دے رہی
تھیں۔ سرسبز و شاداب پہاڑیوں پر دیودار کے مشہور و معروف درخت خوبصورت

مکان اور درختوں کے درمیان دوڑتی ہوئی سلیٹی رنگ کی سڑکیں۔ جن پر
موٹریں رواں دواں تھیں۔ کسی فنکار کے تخیل سے کم نہیں۔ دیودار کے یہ
درخت حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی پسند آئے تھے۔ بیروت دنیا کے
قدیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ سب سے پہلے بیرتیس کہا جاتا تھا۔ حضرت سلیمان
نے لبنان کے ایک اور قدیم شہر ٹائیر کے بادشاہ کی مدد سے ۳۰ ہزار آدمی
کئے تھے جو دس دس ہزار کی تین ٹولیوں میں منقسم تھے۔

ہر جماعت دو ماہ تک دیودار کے درخت کاٹ کر لیجاتی تھی۔ اسی
لکڑی سے حضرت سلیمان نے یروشلم میں ایک عظیم الشان مندر تعمیر کیا
تھا۔ بائبل کے نغمے ــــ سلیمان کی نظموں میں لبنان کی حسیناؤں اور دیودار
کے خوبصورت درختوں کا ہی ذکر ملتا ہے۔ حضرت سلیمان کے بھیجے
ہوئے ان مزدوروں نے اس وادی میں قدم رکھا ہوگا تو خدا معلوم اس سرزمین
پر کیسے کیسے ڈرامے ہوئے ہوں گے۔ ان گیتوں سے بس اتنا معلوم ہوتا ہے
کہ لبنان کی دوشیزہ ان پہاڑیوں پر بھیڑیں چراتی تھی۔ اور اس کے گیتوں
سے وادیاں گونج اٹھتی تھیں۔ رات کو وہ ہاتھوں اور پیروں میں مہر لگاتی اور
گھر کا دروازہ بند کر لیتی۔ آدھی رات گزر جاتی تو اجنبی دروازہ پر دستک
دیتا۔ یہ کہتی میرے ہاتھ پیروں میں مہر لگا ہے۔ میں دروازہ نہیں کھول سکتی۔
اجنبی مایوس ہو کر چلا جاتا تو پھر یہ دریچے سے واپس جانے والے کو دیکھتی رہتی

معلوم ہوتا ہے کہ جس کو اس نے اپنے دروازے سے واپس کر دیا وہ تو اس کا محبوب تھا۔ رات کے اندھیرے میں چادر اوڑھ کر اپنے محبوب کی تلاش میں نکلتی ہے لیکن شہر کی سڑک پر اسے چوکیدار لوٹتا۔ اور وہ اپنی نادانی پر کف افسوس ملتی واپس ہو جاتی۔

اجنبی اپنی محبوبہ کو لاکھوں دوشیزاؤں میں پہچان لیتا۔ میری محبوب اس سرزمین کی بیٹیوں کے جھرمٹ میں ایسی نظر آتی ہے جیسے کنول کا پھول کانٹوں کی جھاڑیوں میں۔

قدیم بیریتس اور موجودہ بیروت عہد قدیم میں شاہی لباس کے لئے رنگ ساخت کرنے میں مشہور تھا۔ بیروت کے رنگوں کی تعریف یونان کے مشہور اندھے شاعر ہومر نے بھی کی ہے۔

بیروت میں ہوا کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کی ٹوپیاں سمندر کی طرف پرواز کرنے لگیں۔ اور لوگ ریستوران میں جانے کی بجائے آباواجداد کی عزت کا تعاقب کرنے لگے۔ ہوا اس قدر تیز ہوئی تھی کہ مجھے رومال سے اپنا منہ پوچھنا پڑا۔ ریستوران میں پہنچ کر کچھ سکون ہوا۔ یہاں بھی دو طرفہ بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے تھے۔ میں گرم کافی کے گھونٹ پی رہا تھا۔ لیکن میری نگاہیں ان شیشوں سے اسی علاقے پر مرکوز تھیں۔ جس کا ذکر صرف تاریخوں میں نہیں داستانوں میں بھی ہے۔ قدیم زمانے میں عربوں کا خیال

تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام لبنان کے پہاڑوں ہی پر قیام پذیر تھے۔ فوسل یعنی اس خاک کی تحقیق کے بعد جس میں گوشت بننے کی صلاحیت موجود ہے اس خیال کی تردید ہوئی ہو گی۔

ایک خاتون نے جو چہرے مہرے سے خالص ایرانی معلوم ہوتی تھیں میرے خیالات کے اس سلسلے کو منتشر کر دیا۔ انھوں نے میرے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کی اجازت طلب کی ان کا نام مسز زرنگار تھا۔ تہران کی رہنے والی ہیں لیکن ایک عرصے سے نیویارک میں مقیم ہیں اور تہران کے مشہور اخبار "کیہان" میں خواتین کے صفحات میں مضمون لکھتی ہیں۔ ان کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں۔ جن میں سے ایک علاج کے لئے اور دوسری تعلیم کے سلسلے میں نیویارک جا رہی تھی۔ مسز زرنگار سے پاکستان کے اخبارات اور پاکستانی خواتین کے متعلق گفتگو شروع ہوئی۔ اس دوران میں ایک لڑکی نے دریافت کیا کہ بیروت میں اس قدر شدید ہوا کا سبب کیا ہے؟ کیا یہ ہوا اس طیارے سے نکل رہی ہے جس سے ہم آئے ہیں یا یہاں ہوا زیادہ ہوتی ہے۔ ہم اس لڑکی کی خیال آرائی پر ہنس پڑے۔

یونان ۔ عظمت نشان

ہم پھر اپنے طیارے میں واپس آئے اور سائپرس سے ہوتے ہوئے یونان کی سرزمین پر پہنچے۔

انسانیت کی تاریخ میں یونان کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔ دنیا کو عبرانیوں نے وحدانیت کا تصور دیا۔ رومنوں نے حفظانِ صحت کا تخیل دیا۔ لیکن اس کے علاوہ دنیا کے پاس جو کچھ ورثہ ہے۔ وہ یونانیوں سے ملا ہے۔ یونان ہومر، سقراط، افلاطون، ارسطو، ایچلیس، سوفوکلس،

یوکلڈ، ارشمیدس، اور ایسپ کا وطن ہے، اور دنیا کا کوئی علاقہ اتنے عظیم نام آج بھی پیش نہیں کر سکتا!

میں آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے کی دنیا میں پہنچ گیا اور ایتھنز کے بازاروں کی سیر کرتا ہوا ڈائیموڈس موچی کی دکان پر ٹھٹک گیا جو ایک جوتا سینے میں مصروف ہے مفلسی نے اس کی پیشانی پر شکنوں کا جال بن رکھا ہے اس کی بیوی تماندار اس کے چہرے پر اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہی ہے۔ تماندار ڈھنڈے چھپرے کی طرف دیکھ کر آہ سرد بھرتے ہوئے) تمہیں یاد ہے وہ ہمارا مرغا۔ کتنا پیارا تھا اس کے سر پر سرخ سرخ تاج، اس کے کالے کالے پنکھ اور اس کی خوبصورت گردن سنگِ مرمر کی طرح سفید اور چمکیلی تھی۔ ہم نے یہ مرغا دیوتا ڈائیونیس کے مندر میں قربان کیا تھا۔ کتنا عرصہ ہوا اس بات کو!

ڈائیموڈس:- یہ پندرہ سال پہلے کی بات ہے۔ ہم اس مرغے کو لیونڈاس کے نام سے پکارتے تھے، اس وقت پندرہ سالہ جنگ ختم ہوئی تھی۔ وہ بھی کیا دن تھے۔ اور اب تو ایک لامتناہی جنگ جاری ہے۔ اور ہمارے پاس ایک مرغا بھی نہیں۔ (زہرخند کے ساتھ) تم اور تمہارے دیوتاؤں نے یہ کیا کر دیا۔؟

تماندار:- (لرز کر) - دیوتاؤں سے گستاخی نہ کرو ڈائیموڈس۔

ڈائیموڈس:- (آہستگی سے) میں انہیں برا بھلا نہیں کہہ رہا تماندار!

مجھے ان پر ترس آ رہا ہے۔ ہم نے دیوتا زیس کو ۵ سال پہلے ایک مرغا بھینٹ چڑھایا تھا اور اب (آہ بھر کر) بے چارے دیوتا۔! انھوں نے بھی اچھا وقت دیکھا ہے۔!"

میں حسین و جمیل، تندرست و توانا اور زیورات سے لدے پھندے دیوتاؤں کے جھرمٹ میں غلسی اور پریشان حالی کی مٹی ہوئی تصویر یعنی دا ایمودس کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سینکڑوں روحانی رہبروں کی سرزمین پر چند جسمانی پیشواؤں کی موجودگی۔ اس کی بربادی کا جواز تھا۔؟

آگ

میرے خیالات کے سلسلے کو طیارے کے کپتان نے منتشر کر دیا۔

انھوں نے اعلان کیا کہ اب ہم روم پہنچ رہے ہیں۔ روم عظمت پارینہ کی یادگار۔ ایمفی تھیٹر اور حشمت و جبروت کا سنگم۔ اس کے بے مثال تھیٹر، انوکھے غسل خانے، حیرت انگیز شاہراہیں، شوکت تعمیر کے نمونہ بنارہ محل، مندر، چوراہوں کے فوارے، مجسمے، دیواروں پر خوبصورت نقش نگار اور پچی کاری کے کمالات۔ پتھر پر ابھرے ہوئے نصف مجسمے یہ سب

مسافر کے سامنے ایک دل آویز منظم بن کر آتے ہیں لیکن پھر یہ نظم پرزے
پرزے ہو کر بکھر جاتی ہے یہ پرزے آناً فاناً ہیں کناروں سے جل اٹھتے ہیں
شعلے فضا میں پھیلنے لگتے ہیں۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی چیخیں نغمۂ
ماتم کے سیل رواں کی طرح کانوں سے زیادہ دلوں پر اثر کرتی ہیں صدیوں
کے اس ہجوم میں بھی نیرو کی بانسری صاف سنائی دیتی ہے ایسی بلند بام
عظمت کے بعد وقت کے اندھے کنوئیں میں روم کی گمشدگی لرزہ طاری کر دیتی
ہے جولیس سیزر کے محل سے دو ہیولے نمودار ہوئے ایک مرد، اور ایک عورت
صدیوں پرانے رواتی رومن لباس میں لیکن جاہ و جلال اور طنطنے کی بجائے
کسی الجھن میں گرفتار۔ یہ ڈیلیس اور اس کی بیوی لوسیا ہے۔

لوسیا:- ڈیلیس! ہمت سے کام لو! شہنشاہ تمہارے قصور معاف
کر دیں گے! چلو اب گھر واپس چلیں۔

ڈیلیس، اگر قصور معاف نہ ہوئے لوسیا؟

لوسیا:- (ادھر ادھر دیکھکر) دیکھو ڈیلیس! ہر شہنشاہ جلد یا کچھ عرصے
بعد دیوتا ضرور بن جاتا ہے۔

ڈیلیس: دیوتا؟ اطمینان رکھو! اسے کوئی قتل نہ کریگا۔ مجھے دس سال
پہلے کی بات آج بھی یاد ہے جب روم کو نیرو نے آگ لگائی تھی۔ کیا حسین
وقت تھا وہ بھی! اب تو ایسا موقعہ بھی آنا مشکل ہے!

ہیں صدیوں پہلے کے انسانوں کے غول سے نکل کر پھر اس دنیا میں
واپس آیا تو مجھے جمیل صاحب نے اشارے سے بلایا اور کہا، یہ گاؤں جو آپ دیکھ رہے
ہیں اس کا نام لیونارڈو ڈاونچی ہے۔"

اچھا! مشہور فنکار ڈاونچی کے نام سے موسوم ہے!

میں یہ سوچنے لگا کہ ہمارے ملک میں رن پٹھانی، پتوکی، پپری، چیچہ وطنی
جھمپیر، کالا شاہ کاکو، کوٹ رادھا کشن، بڑے بڑے قصبوں کے نام ہیں کیا انہیں
بڑے فنکاروں اور علم کے بڑے خدمت گذاروں کے نام سے موسوم نہیں کیا
جاسکتا۔ میں اپنی عیاشانہ خیال آرائی پر خود ہی شرمندہ ہو گیا۔ کیونکہ ہم پاکستان
کے سب سے عظیم شہر کراچی کی انگریزی سڑکوں یعنی میکلوڈ روڈ، بنس روڈ
رابسن روڈ، پرنسس اسٹریٹ، انگل روڈ اور سمرسٹ اسٹریٹ کو پاکستانی نہ بنا سکے

میں اپنے طیارے میں پھر اپنی نشست پر موجود تھا۔ مجھے اپنا سفر بہت تیز
معلوم ہو رہا تھا میرے دل و دماغ پر ایک گراں باری کا احساس تھا گویا باہر چاندنی
رات میں کسی جنگل کی پتلی سی پٹیا پر رواں دواں ہوں دونوں طرف دیو قامت
درخت اور ان کے خوفناک سائے ہیں اور چاندنی رات کی لطافت بھی جنگلی گھاس
کی بھیگی ہوئی بدبو کے ساتھ لونگ کے پھولوں کی تڑپتی ہوئی خوشبو بھی ہے یہ
خوشبو کبھی ضرورت سے زیادہ اور کبھی درختوں کے اندھیرے اور گھاس کی بو کا
نعم البدل معلوم ہوتی ہے اب ہم جزیرہ ایلبا پر پرواز کر رہے تھے یہ سیاہی مائل زرد

جزیرہ سمندر کی طوفانی لہروں میں ریگ بجرہ معلوم ہوتا تھا اس پر دنیا کا عجیب و غریب شخص نپولین اب بھی کھڑا ہوا اپنی شبانہ عظمت کی گمشدگی پر حیران تھا اسکی آنکھوں سے نگاہوں کا عقابی نزول اور اس کے ماتھے پر اب بھی بالوں کی ایک لٹ ہلال کی طرح خمیدہ تھی اسکی زبان پر اب بھی ، لفظ ، ناممکن احمقوں کی لغت میں ہے ، کا ورد تھا اسے اب بھی یقین تھا کہ وہ فرانس پہنچ جائے تو پورا فرانس اس کے پرچم کے سائے میں جمع ہو جائے گا۔

ہم لندن پہنچ چکے تھے اب ہمیں یہاں سے بحر اوقیانوس کی دہلا نیوالی وسعتوں کو عبور کر کے نیویارک پہنچنا تھا یہ نشیب و فراز سفر اچھے اچھوں کو عبادت گذار بنا دیتا ہے سب گردن جھکائے نقوبہار کی ہجے کرنے میں معروف تھے یکایک نگاہوں کے سامنے گہری سبز زمین اور اس پر یاقوت زمرد نیلم اور الماس کے گلوبند بکھرے نظر آئے یہ منظر نطشے کی ناقابل فہم لیکن دلکش نظموں کا تاثر لئے ہوئے تھا۔ لندن سے نیویارک کا طویل سفر وقت کے اعتبار سے کسی کرتبی پروفیسر کا کمال معلوم ہوتا ہے لندن ایئرپورٹ کی گھڑی میں وقت دیکھنے کے بعد آئیڈیل وائلڈ ایئرپورٹ کی گھڑی میں وقت دیکھا تو معلوم ہوا کہ ساڑھے سات گھنٹے سکڑ کر صرف ایک گھنٹے کی پرواز میں بدل گئے ہیں۔

فلک شگاف - نیویارک

نیویارک کے آئیڈیل وائلڈ ایئرپورٹ کی زمین سے قدم لگتے ہی یہ احساس ہوتا ہے کہ پنڈورا اپنی صندوقچی یہیں بھول گئی تھی - پین امریکن ورلڈ ایئرویز کی مسافر نواز عمارت، جیومیٹری کی خوب صورت اشکال کو پیش نظر رکھ کر بنائی گئی ہے - اس میں روشنی کا اہتمام ایسا ہی ہے جیسے غزل میں موسیقی کا - !

ہم ایئرپورٹ کے ایوانِ خاص میں داخل ہوئے تو ایک امریکن خاتون جو ایئرپورٹ کے عملے سے تعلق رکھتی تھیں، مسکرا کر آگے بڑھیں اور انھوں نے

مجھ سے اردو میں کہا۔

"سلام ! مسٹر تیموری"! میں اس استقبال پر ششدر رہ گیا۔ حیرانی اس لئے زیادہ تھی کہ انہیں میرا نام کیسے معلوم ہو گیا۔ میں نے جواب میں "وعلیکم السلام" کہکر انگریزی میں اپنے جذبات کا اظہار کیا "خدا آپ لوگوں پر اپنی رحمتیں نازل کرے"!

ان خاتون نے اپنا سیدھا ہاتھ اٹھالیا اور کہا۔

"پاکستان زندہ باد"۔ میں نے جواب میں کہا

"امریکہ اور دنیا کی تمام قومیں تا دیر زندہ رہیں!"

اس کے بعد انہوں نے اردو میں اور میں نے انگریزی میں شکریہ ادا کیا۔ آئیڈیل ولڈ ایرپورٹ کرسمس کی وجہ سے خوب سجا ہوا تھا۔ اس ایرپورٹ میں شیشے کے خودکار دروازے ہیں۔ ایک دروازہ اندر آنے کے لئے اور ایک باہر جانے کیلئے۔ یہ دروازے از خود کھلتے اور بند ہو جاتے ہیں ایک بڑے میاں جو شاید ڈچ تھے، ہماری طرح اپنے ساتھیوں کے انتظار میں کھڑے تھے۔ یکایک انہوں نے شیشے کے دروازوں سے نیویارک کو دیکھا اور بیرونی دروازے سے باہر نکل گئے انھیں اندازہ ہوا کہ ہوا بہت سرد ہے تو واپس آنا چاہا مگر دروازہ بند ہو چکا تھا۔ انہیں اندر آنے کے لئے معین دروازے کا علم نہ تھا چنانچہ پریشانی کے عالم میں اسی دروازے کو کھولنے کی کوشش کر رہے

تھے جس سے وہ باہر گئے تھے۔ سب لوگ ان کی پریشانی پر ہنسنے لگے اور انہیں اشارے سے بتایا کہ وہ غلط دروازے پر کھڑے ہیں۔ اب ہم ٹیکسی میں بیٹھکر ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے اس ٹیکسی میں ایک ریڈیو اور ایک مائک موجود تھا ٹیکسی اسٹینڈ سے ٹیکسی ڈرائیور کی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا اور ٹیکسی اسٹینڈ کو بتانا جا رہا تھا کہ وہ کہاں کہاں سے گذر رہا ہے۔ اس دوران میں ٹیکسی اسٹینڈ سے دریافت کیا گیا کہ ایک پاکستانی مسافر کا بیگ ایرپورٹ پر رہ گیا ہے۔ یہ تمہاری ٹیکسی کے مسافروں میں سے تو کسی کا نہیں۔؟ ڈرائیور نے ہم سے مڑ کر پوچھا اور پھر انھیں جواب دیا کہ ہمارے مسافروں کا بیگ نہیں۔

مجھ پر نیویارک کا انتظامی رعب طاری تھا۔ ادھر نیویارک کی مشہور و معروف فلک شگاف عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا سخت سردی کی وجہ سے بازار اور گلیاں سنسان تھیں۔ لیکن موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ بند دکانوں کے شیشہ ایونوں سے روشنی کی جھلملاہٹ اور سڑک کے زمین دوز دہانوں سے اٹھتا ہوا گیس کا دھواں ایک پراسرار سماں پیدا کر رہا تھا۔

ہم پارک ایونیو میں بیل مونٹ پلازہ ہوٹل پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ اس کے پہلو میں وہ مشہور و معروف ہوٹل ہے جو اسٹوریا کہلاتا ہے۔ یہ ہوٹل نہیں بلکہ ایک محل ہے۔ اس میں دو ہزار ملازم

اور ۲۰۰، ۲ کمرے ہیں۔ اس ہوٹل میں اسٹیونسن، میک آرتھر، ڈیوک آف ونڈسر، کول پورٹر، اور شیر سار بان قیام کر چکے ہیں۔ اس ہوٹل کی یہ روایت ہے کہ اس میں دنیا کے جن جن علاقوں کے سیاسی نمائندے قیام کرتے ہیں، ان کے پرچم آویزاں کیے جاتے ہیں۔ نیویارک کی عمارتوں کے بالائی سرے کو ٹوپی پہن کر دیکھا جائے تو ہر بار ٹوپی سڑک سے اٹھانی پڑے گی۔ بہرس تعمیر کے ان نمونوں کو دیکھتے ہی مجھے اپنے عزیز شاعر والٹ وہٹ مین کی نظم "نیویارک" یاد آگئی۔

والٹ وہٹ مین کا قصیدہ

پورے عالم کا شہر (کیونکہ یہاں تمام نسلیں آباد ہیں) کرۂ ارض کی تمام سرزمینوں نے اس کی تعمیر میں شرکت کی ہے۔

سمندروں کا شہر، رواں دواں، چمکتی دمکتی موجوں کا شہر —

وہ شہر جس میں مسرت کی موجیں لہرا کر آتی اور رقص کرتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔

یہ موجیں اپنی آغوش میں کبھی گرداب لاتی ہیں اور کبھی پلٹ کر

کف اُچھالتی ہیں۔

بندرگاہوں اور گوداموں کا شہر

سنگ مرمر اور فولاد کی عظیم عمارتوں کا شہر

جوانی کے غرور میں سرشار اور جذبات کی لَو پر جلتا ہوا شہر

طرار، مست اور عیش پرست شہر

اے شہر! تو صرف امن کی حفاظت نہ کر بلکہ امن کے حصول کیلئے
مجسم جنگ بن جا۔! تو فکر نہ کر۔ کسی اور کی طرز پر نہ جا۔! اپنی ہی
پیروی کر!

والٹ وہٹ مین کی یہ نظم۔ عہد قدیم کی یادگار ہے مگر آج کا نیویارک
اس میں پوری طرح جھلکتا ہے۔ اب ایک اور لطیفہ بھی سن لیجئے۔ بائرن
رفس نیوٹن نیویارک ہیرلڈ کا رپورٹر تھا۔ اس نے ۱۹۰۶ء میں۔ نیویارک پر
حسب ذیل نظم لکھی۔

" بے ہودہ طرز ماند و بود، خوش خوراک، خوش لباس

اور کم تربیت یافتہ

سنگدل، خدا سے دور، جہنم کا سرمایہ

دن کے وقت بدتمیز اور رات کو بدمست

قیمتی لباسوں میں مفلسی پوشیدہ

ہذیان بکتے ہوئے، پستیوں میں گھلتے ہوئے روپے کے دیوانے

شیطان کے گلے کے ساتھ چلنے والے

انسانی گوشت کے جنون میں گرفتار

لالچ، فحاشی اور دقیانوسیت کے گھوارے

نیویارک! تو ایک دیوانے کی بڑ ہے!!"

اس گرماگرم نظم کی تصنیف کے تیرہ سال بعد جب نیوٹن کو بندرگاہ نیویارک
کا کلکٹر آف کسٹمز مقرر کیا جانے لگا تو نیویارک کے شاہین بچے میدان میں
آ گئے۔ آخرکار نیوٹن کو ہاتھ باندھ کر اعلان کرنا پڑا کہ یہ نظم محض خوش ذوقی
کا کرشمہ تھی اور کچھ نہیں۔

نیویارک بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں ۵۰ زبانیں بولی جاتی ہیں اور
۲۰ غیر ملکی زبانوں میں اخبار نکلتے ہیں۔ نیویارک کی دولت کا اندازہ لگانا
مشکل ہے لیکن اٹکل کے لئے یہ خبر بھی کافی ہے کہ یہاں ہر سال ایک کروڑ
چالیس لاکھ سیاح آتے ہیں۔ نیویارک کو سیاحوں سے جو آمدنی ہوگی وہ بعض
ملکوں کے سالانہ بجٹ سے کہیں زیادہ ہوگی۔ نیویارک کی عظمت، شہرت
دولت اور سیاسی اقتدار سے امریکہ کی دوسری ریاستوں کے باشندے حسد
کرتے ہیں اور نیویارک کو جرائم اور فضول خرچی کا مسکن ٹھہراتے ہیں۔

بیل مونٹ پلازہ ہوٹل میں عام خدمت، نیگرو عورتیں اور لفٹ چلانے

کا کام نیگرو مرد کرتے ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ نیویارک میں چھوٹے موٹے کام نیگرو ہی انجام دیتے ہیں۔ پورے امریکہ میں نیویارک ہی ایک ایسا شہر ہے جہاں کالے نگاہوں میں نہیں کھٹکتے ورنہ امریکہ کی دوسری ریاستوں میں ماتمی ملبوں کے علاوہ اور کوئی کالی شئے برداشت نہیں کی جاتی۔

سنٹ کے اراکین نیگرو باشندوں کو حقوق دینے کی مخالفت کرتے کرتے اکثر نیویارک کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ کیونکہ نیویارک آغوش مادر اقوام متحدہ ہے اور یہاں نیگرو بخت نسلی امتیاز کا شکار نہیں۔ ایسٹ لینڈ نے ایک مرتبہ اپنی تقریر میں کہا۔

”نیویارک میں عصمت دری، قتل اور جو دوسری برائیاں نظر آتی ہیں اس کا سبب آبادی میں نسلوں کا پھیلاؤ ہے۔“ اس کے بظاہر یہ معنی ہوئے کہ امریکہ کے چند عالی نسب گورے تمام خرابیوں کا ذمہ دار کالوں کو گردانتے ہیں۔ روزویلٹ نے جب یہ الفاظ کہے ہوں گے تو خدا جانے ان کا مانی الضمیر کیا ہوگا۔ اور اسے جنوبی امریکہ کے شہزادوں نے سمجھا ہوگا یا نہیں۔

”ہم صرف اپنی نسل کے لئے تعمیر اور تحفظ کا اہتمام نہیں کر رہے، ہم اپنے آباد اجداد کی ڈالی ہوئی بنیادوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ ہم ایک نسل کی زندگی کا بندوبست کر رہے ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ ہم صرف امریکہ کے تحفظ اور تعمیر کیلئے مستعد نہیں بلکہ پوری انسانیت کیلئے کمر بستہ ہیں۔“

امریکن شخصیت میں زندگی کا ولولہ اور فکر کا انوکھا پن نظر آتا ہے۔ شاید اسی لئے امریکن ایک عرصے تک یورپ کی ان اقوام کے لئے تفریح کا مشغلہ ہے، جن کا رہن سہن طور طریق اور انداز فکر صدیوں کی دھوپ کھا کر ایک تہذیبی اچار کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس وقت مجھے ڈاکٹر جانسن کا وہ جملہ یاد آگیا جو بوسول نے نقل کیا ہے۔ بہر حال دروغ بر گردن بوسول۔!

”میں امریکیوں کے سوا تمام بنی نوع انسان سے محبت کر سکتا ہوں۔“ ڈاکٹر جانسن جیسے امن پسند شہری کی جیب میں قانونی ناپ سے بڑا چاقو دیکھ کر مجھے ہمیشہ حیرت ہوئی۔

امریکیوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر انگریزی بولنی شروع کی تو انگریزوں کو یہ رنگ ریزی ناگوار گذری، پہلے تو وہ انڈین انگلش کا دل کھول کر مذاق اڑاتے تھے، پھر امریکیوں کی انگریزی کا مذاق اڑانے لگے مگر ڈاکٹر جانسن امریکیوں سے کیوں اتنے خفا ہو گئے یہ جملہ انھوں نے، جام نگر، میں کسی امریکن سے تو تو میں میں کے بعد کہا ہوگا۔

ہاں تو ذکر امریکیوں کی انگریزی بلکہ امریزی کا تھا اس میں انگریز کا ڈھنگ نہ تھا، امریکہ کی آمیزش تھی۔ اس امریزی نے رفتہ رفتہ فتح حاصل کی۔ چنانچہ آج امریکیوں کا صوادی نعرہ (O.K) پوری دنیا میں بجلی سے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی سیکڑوں ترکیبیں

اور لفظی دریافتیں آج خبر بالکل نہیں۔

امریکہ میں ایک نیا رجحان یہ ہے کہ محاورۂ عوام کو فصیح اور درست سمجھا جائے۔ بنیادی خیال یہ ہے کہ زبان بدلتی رہتی ہے اس لئے زبان خواص اور زبان عوام کی جدائی غلط ہے اسی طرح اختصار کے شوق میں نئی نئی اختراعات ہوتی رہتی ہیں۔ لفظ فائنل (Final) سے فعل بنایا گیا۔ Finalize - اسے صدر کینیڈی نے بھی تقریر میں استعمال کر لیا۔ جس پر اخبارات میں بہت ہنگامہ ہوا۔ لیکن ماہرین کی رائے میں اسے درست قرار دیا گیا۔ اسی طرح جیٹ طیارے سے پہنچانے کے لئے JETTED, یعنی جٹیانا اور ہنی مون منانے کے لئے HONEYMOONED یعنی ہنی مونانا۔ بچوں کو کہانی سنانے کیلئے CHILDREN WERE STORIED یعنی بچوں کو کہانیا جائے گا کہتے ہیں۔ مجھے اپنے دورِ طالب علمی کا ایک لطیفہ یاد آگیا۔ میں ورجنیا ولف کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ جس میں اس نے ایک جگہ INDISPUTARLY GREAT لکھا تھا یعنی "غیر متنازعہ عظیم"۔ مجھے یہ ترکیب پسند آئی اور میں نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں استعمال کیا۔ ہمارے پروفیسر مسٹر کیلاٹ نے جب یہ ترکیب پڑھی تو غصے سے لال پیلے ہو گئے۔

کہنے لگے۔ "تم نے کب سے غلط انگریزی لکھنی شروع کر دی"۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ اس ایجاد کا الزام اس ناتواں پر نہیں بلکہ ورجنیا ولف پر عاید ہوتا ہے، تو انھیں یقین نہ آیا۔ میں نے کتاب میں نشان دہی کی تب بھی ان کا غصہ کئی دن تک ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔

ایک دن صبح میں نے کمرے کے دریچے سے پردہ ہٹایا تو دیکھا کہ سڑک سے برف کی صفائی ہو رہی ہے۔ نیویارک ابھی خانہ نشیں تھا۔ میں نے سوچا لاؤ کولمبیا یونیورسٹی میں اپنے دوست ناجی سے بات کی جائے ٹیلیفون کا چکر گھمایا تو آواز آئی :-

"آپ جن صاحب سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں، ان سے آپ آٹھ بجے کے بعد بات کر سکیں گے کیونکہ آپریٹر نہیں ہے۔"

یہ پیغام ریکارڈ کیا ہوا تھا مجھے مشینوں کی کارگذاری بلکہ قومی خدمت کا احساس ہوا لیکن میرے اس تاثر کو زائل کرنے کیلئے ایک صاحب نے یہ قصہ سنایا کہ ایکدن کسی کی غلطی سے دوسرا ریکارڈ لگ گیا اور ذیل کے الفاظ سنائی دیئے۔

"یہاں آگ لگ گئی ہے آپ لوگ اپنے کمروں سے فوراً باہر آجائیں"۔

جن جن لوگوں نے فون پر یہ پیغام سنا انہوں نے گھبرا کر آتش فرو انجن بھیجنے شروع کر دئے : بڑدست بھاگ دوڑ کے بعد معلوم ہوا کہ آگ الفاظ سے لگی تھی۔

گردنِ مینا

بہرحال آٹھ بجے کے بعد مسٹر نابخی سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے مجھے نیویارک کو پیدل دیکھنے کی دعوت دی یہاں فاصلہ کا اندازہ فرلانگ یا میل سے نہیں بلکہ عمارتی بلاک سے کیا جاتا ہے مثلاً فلاں جگہ یہاں سے ۵، ۱۰، یا ۲۰ بلاک دور ہے۔ ہر بلاک میں ایک قصبے کی آبادی کے مساوی لوگ مقیم ہوتے ہیں ہم بلاکوں سے گذرتے ہوئے بڑی بڑی سڑکوں کو عبور کرنے لگے۔ جگہ جگہ "چلئے" اور "مت چلئے" کے لفظ سبز روشنی میں نمودار ہو کر بجھ بجھ جاتے

یہ وہ مقامات تھے جن کو انگریزی میں BOTTLENECK اور اردو میں "گردنِ مینا" کہا جاتا ہے جس طرح مینا میں کاک پھسل کر گر پڑے اور آپ نکالنا چاہیں تو گردن میں پھنس جاتا ہے اسی طرح پا سوار لیے نکڑوں پر پھنسے ہوئے یا کھڑے ہوئے رہ جاتے ہیں۔ جن صاحب کا یہ قول تھا کہ "مجھے دنیا میں کھڑے ہونے دیجئے۔ میں اسے ہلا کر رکھدوں گا" اگر وہ نیویارک میں ہوتے تو شاید پولیس انھیں ہلا دیتی۔

رکتے، مڑتے، گھومتے ہم راک فیلر سنٹر پہنچے جو ۱۶ عظیم عمارتوں پر مشتمل ہے اسی میں ٹائم اینڈ لائف بلڈنگ۔ اور آر سی اے بلڈنگ ہے جو کسی زمانے میں ریڈیو سٹی کہلاتی تھی، ان عمارتوں کے تہہ خانوں میں بازار اور ریستوران ہیں۔ ان عمارتوں میں دن کے وقت ۱۷۵،۰۰۰ ہزار افراد موجود ہوتے ہیں۔

یہ امریکہ کے مشہور سرمایہ دار راک فیلر نے تعمیر کی ہیں۔ ان تمام عمارتوں کا کرایہ کولمبیا یونیورسٹی کو ملتا ہے اور ۹۹ سال بعد یہ یونیورسٹی کی ملکیت ہو نگی علم و فن کی ترقی کے لئے حکومت کی سرپرستی لازمی ہے۔ لیکن ملک کے دولتمند ایثار کا جذبہ پیدا کریں تو ۲۰ سال کی راہ ۱۰ سال میں طے ہو جاتی ہے۔

راک فیلر سنٹر کی آغوش میں ایک بڑا حوض ہے۔ جس میں اسکیٹنگ یعنی برف پر پھسلنے کی مشق کرنے والوں کے لئے مصنوعی برف پیدا کیجاتی

ہے اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں نہیں بلکہ ایجاد ضرورت کی ماں ہے۔

ہم چلتے چلتے تھک گئے تھے اس لئے مسٹر نانجی کے اصرار پر امریکہ کا محبوب ناشتہ "ہیمبرگر" چکھنے کے لئے ایک ریستوران میں داخل ہوئے۔ یہ ایک سستی غذا ہی نہیں بلکہ لذیذ ناشتہ بھی ہے۔ ہیمبرگر ایک طرح کی سینڈوچ ہوتی ہے۔ کلچوں کی طرح دو چھوٹی چھوٹی گول روٹیوں کے درمیان گائے کے گوشت کا تلا ہوا پارچہ رکھا ہوتا ہے یہ سینڈوچ ہمبرگ (جرمنی) سے منسوب ہے اس کے نام رکھوانے ایسی کوئی شے ہمبرگ میں کھائی ہوگی رفتہ رفتہ لوگوں نے اس نام کو سمجھنے میں غلطی شروع کی وہ سمجھے "ہیم" یعنی سور کا گوشت اور "برگر" کے معنی روٹی فرض کر لئے گئے اس روشنی کی شہ پاکر مختلف ریستورانوں نے کچھ عرصے "ایگ برگر" (انڈا روٹی) "چیز برگر" (پنیر روٹی) اور "چکن برگر" (مرغی روٹی) کے اشتہار دئے آخر میں یہ "برگر" گڑبڑ میں غائب ہوگئے اور ہیمبرگر اب تک باقی ہے۔

سورج غروب ہوا اور نیویارک اندھیروں میں ڈوبنے لگا لیکن دفعتہً سب عمارتیں شب برات کی رنگین قندیلوں کی طرح جگمگانے لگیں۔ نیویارک کی رات اپنی مسکراتی ہوئی روشنیوں اور بہلا دو سے لبھانیوالے تماشوں کے لئے مشہور ہے۔ یہاں کے تھیٹروں میں

خوش آواز موسیقاروں سے لیکر قدرتی لباس میں در آنیوالی رقاصائیں تک سماعت اور نگاہوں کو آسودگی بخشتی ہیں تاہم ایسی محفلیں ادب اور تہذیب کے دائرے سے باہر نہیں۔ یہاں ایک رقص جسے "چھا چھا" کہتے ہیں بہت مقبول ہے یہ مشکل رقص ہے کیونکہ اس میں تیزی ادا شرط اوّل ہے اس رقص میں میں نے ایک ایسی خاتون کو دیکھا جن کا پیٹ قتیل محبت کی وجہ سے نفخ ہوگیا تھا میری یاد داشت میں یہ انوکھا واقعہ تھا اور میں سوچتا رہ گیا کہ عورت رقص کے بعد ماں بنتی ہے یا ماں بننے کے بعد رقص کرتی ہے۔

نیویارک ایک جوان اور زندہ دل شہر ہے یہاں زندگی ہمک کر بڑھتی ہے۔ اور مسکراہٹ میں خلوص کی گرمی پائی جاتی ہے۔ اگر یہاں ۱۰۲ منزل طویل ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ نہ ہوتی تب بھی یہ خصوصیت اسے سیاحوں کی جنت بنا دیتی۔

میری جیب سے ڈالر تیزی سے نکلے چلے جا رہے تھے۔ پھر سفری چیک بھنوانے بلکہ "بھوننے" کی ضرورت تھی میں نے چیک پر دستخط کرنے چاہے مگر قلم میں روشنائی ختم ہو چکی تھی، بینک کی نگراں خاتون نے بہت بے پروائی سے پنسل آگے بڑھا دی اور کہا،

اس سے دستخط کر دیجئے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہاں چیکوں

پر پنسل سے دستخط قابل قبول ہیں اور کراچی کے بینکوں کی طرح دستخطوں کی اس قدر جانچ پڑتال نہیں کی جاتی ایکدوسرے پر بھرپور اعتماد کیا جاتا ہے۔

شام کو میں ٹائمز اسکوائر چلا گیا جہاں برقی حروف میں تازہ خبریں نمودار ہو رہی تھیں یہ بہت بڑا بازار ہے اور شام کو یہاں بہت رونق ہوتی ہے۔

ٹہلتے ٹہلتے میں ایک کتابوں کی دوکان میں داخل ہو گیا۔ یہاں میں نے چارلس ہملٹن کی کتاب دیکھی جو انہوں نے آٹوگراف اور انفرادی تحریروں پر شائع کی ہے اس کتاب پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ امریکہ میں سابق صدر آئزن ہاور کی تحریریں جس افراط سے دستیاب ہوتی ہیں اور انکی جتنی قدر ہے جارج واشنگٹن کی تحریروں کی بھی نہیں۔ صدر کینیڈی کا معاملہ ہی کچھ اور ہے ان کے دستخط کا انداز بدلتا رہتا ہے۔ ایک اور شخصیت بھی دستخط کے معاملے میں عجیب و غریب تھی یعنی نپولین اس کے دستخط فتوحات کے ساتھ پھیلتے اور شکستوں کے ساتھ سکڑتے رہتے۔ چارلس ہیملٹن کا بیان ہے کہ امریکہ میں دستاویزات و خطوط پر صدر کے سکریٹری ان کے دستخط کی نقل کرتے ہیں۔ بہت کم ایسے کاغذات ہوں گے جن پر صدر خود دستخط کرتے ہوں۔

جزیرۂ آزادی

اَب کے نیویارک میں غیر معمولی برفباری ہوئی تھی اور سب "سفید کرسمس" کی خوشیاں منا رہے تھے، ہم نے کرسمس گھوم کر گزارا، براڈوے، چائنا ٹاؤن، فائننشل ڈسٹرکٹ، جزیرۂ مین ہٹن اور پارک کا نظارہ کرتے ہوئے یو این، او پہنچے جو ساری دُنیا کی نگاہوں کا مرکز ہے۔ پھر آگے چل کر اسٹیمر میں دریائے ہڈسن سے گزرتے ہوئے جزیرۂ آزادی کا رُخ کیا جہاں آزادی کا مجسمہ بیچ سمندر میں نصب ہے چاروں طرف گہرے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور تا حدِ نظر

موجوں کے ستون بہتے ہوئے نظر آرہے تھے ، اسٹیمر تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اور مجسّمے کی نمود کے خط و خم صاف نظر آرہے تھے ایک تنومند عورت سر پر تاج پہنے بائیں ہاتھ میں کتاب اور دائیں ہاتھ میں مشعل لئے کھڑی ہے یہ آزادی کی دیوی ہے جو اپنی مشعل سے دُنیا میں بیداری کا اُجالا کر رہی ہے۔ اس مشعل میں روشنی نہ تھی بادلوں کے مٹیالے غبار سے جھلکتا ہوا یہ مجسّمہ ، درد کی ایک تصویر معلوم ہو رہا تھا، اس کی نگران آنکھوں میں یاس و حرماں کی تحریر اور سینے میں ایک تڑپ تھی، وہ سمندر اور آسمان کے سنگم کی طرف دیکھ رہی تھی مجسّم انتظار! میں نے سیاحوں کی کتاب میں لکھا ۔

" خُدا کرے مشعل آزادی کی روشنی ساری دُنیا میں پھیل جائے "۔

ایک انگریز خاتون اپنے بچوں کو ہاتھوں کے حصار میں لئے کھڑی تھیں ، اور مجھے لکھتا ہوا دیکھ رہی تھیں ، جب میں نے اپنے نام کے ساتھ پاکستان " لکھا تو وہ خاتون مسرت سے چلاّنے لگیں " میرے بچو ! دیکھو پاکستان کے لوگ بھی ہماری جیسی انگریزی لکھ سکتے ہیں " پھر انھوں نے اُوپر دیکھ کر کہا " میں کتنی خوش قسمت ہوں، آج تو دیس دیس کے آدمیوں کو دیکھ رہی ہوں "۔

" محترمہ ! " میں نے کہا " پاکستان میں ایسے لوگ بہت ہیں جو انگریزوں کی طرح انگریزی لکھ سکتے ہیں ، لیکن کیا آپ اپنے ہم وطنوں میں سے کسی ایک کا نام بتا سکتی ہیں جو اسی طرح اُردو لکھنے پر قادر ہو ! "

میرا دل عجیب و غریب خیالات کی آماجگاہ تھا، برف کی سِلوں میں سے نکلے ہوئے سیاہ درختوں کی ٹہنیاں ہوا کے تھپیڑوں سے لرز رہی تھیں۔ مجھے ایک آواز آئی ۔ کیا آزادی کا مجسمہ نصب کرنے کے بعد آزادی کی تحریک ختم ہو گئی یا آزادی کی وفات حسرت آیات پر اس کی یادگار قائم کی گئی ہے ، اور کیا آزادی کا نام اب لغت میں اور نیویارک کے ساحل پر باقی ہے ۔

ایک سو ایک غلامیوں کے بوجھ سے دبے ہوئے سیاح ان بچوں کی طرح جو مختصر میعاد دھوکوں سے بہل جاتے ہیں ، خوش ہو ہو کر ہر زاویے سے مجسمے کی تصویر اتار رہے تھے یہ خوشی اس لئے نہیں تھی کہ وہ آزاد تھے اس لئے کہ وہ مجسمہ آزادی کے قدموں میں کھڑے تھے ۔ چھوٹے بچے ، رنگین پتھر ، کاغذ کے ٹکڑے اور چھپتی مرغیوں کے پر جمع کر کے اپنے خزانے پر ناز کرتے ہیں اسی طرح یہ معصوم بڑے اپنی یاد کے پٹارے ہیں مختلف تصویریں جمع کر کے فخر کریں گے اور شاید کبھی نہ سوچیں گے کہ وہ حقیقت کی آغوش میں آکر نکل نکل گئے ہیں ۔

جب انسان نے پہلی مرتبہ خدا سے دور ہونا چاہا تو اس نے سنگ مرمر کو تراش کر خدا کا بُت بنایا ، پھر اس بُت کو اپنے گھر میں قید کر دیا وہ خدا جو عالم بسیط سے اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا ، اب اس کے ڈرائنگ روم کے صدر مقام پر بے حس اور ساکت بیٹھا تھا ، ایسے میں انسان کو بیچ کی دیوار کا سہارا کافی تھا ۔ اسی طرح بڑے بڑے رہنماؤں اور داناؤں کے احسانات کے

بوجھ سے کسی قوم کی گردن جھکنے لگی، اور تعلیم سے چھٹکارا مشکل نظر آیا تو قوم نے ان کے مجسمے بنا کر نہ صرف وہ قرض چکایا جو واجب الادا تھا، بلکہ اس کی تعلیمات کو ترک کرنے کیلئے جواز بھی حاصل کیا۔ مگر یہ بے چاری آزادی تو کبھی ہیڈ ماسٹری کے جرم میں پکڑی نہیں گئی تھی۔!

ہم پھر اپنے اسٹیمر میں واپس آئے یہاں ایک دوکان تھی جس میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کے علاوہ کافی اور گرم کتے (HOT DOGS) فروخت ہو رہے تھے گرم کتے سیخ کبابوں کا نام ہے لیکن یہ کباب سور کے گوشت کے ہوتے ہیں۔ ہم ساحل پر اترے تو چاروں طرف بھر بھری برف کے انبار لگے تھے جوتے اور پتلون کا نچلا حصہ برف سے سفید ہو رہا تھا۔ دور کی عمارتیں سفید کاغذ پر پنسل کا خاکہ معلوم ہو رہی تھیں۔

لفظوں کی فتوحات

کرسمس کی وجہ سے بازار بند تھے لیکن دکانوں کے شیشہ دیواروں سے دنیا کی تمام اشیاء سر نمائش تھیں یہاں بارہ سو ڈالر یعنی ساڑھے پانچ ہزار روپے کی قیمت کے فراک بھی تھے جنہیں عالی مرتبت خواتین زیب تن کرتی ہیں ان فراکوں میں کپڑے اور سلائی کا قیمتی حصہ ایک تہائی اور باقی حصہ اشتہارات کے لئے مخصوص کیا جاتا ہے، ہمارے ہاں اشتہار کی تعریف سمجھنے میں ہمیشہ غلطیاں ہوئیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں الفاظ

کی تجارتی قدر و قیمت پر بہت کم توجہ دی گئی، اور کبھی ان کی درجہ بندی نہیں ہوئی ہم نے زمین کھود کر گیس نکالی اور اس کی افادیت کا فوراً اقرار کر لیا۔ لیکن والد کی بیوی اور والدہ کے تاثیری فرق پر کبھی غور نہیں کیا۔ شکسپیر کے مشہور ڈرامے "جولیس سیزر" میں الفاظ کے تجارتی شعور کا بہترین مظاہرہ ہے جب عظیم رومن جولیس سیزر قتل ہو گیا اور اس کی لاش کو درشن کے لئے رکھا گیا تو بروٹس منبر پر کھڑا ہوا۔ اور اس نے کہا۔

رومنو! ہموطنو! دوستو!" صرف اس طرز تخاطب نے جولیس سیزر کے سانحے کو فراموش کر دیا۔ اور وہ بروٹس جو شاید سیزر کے قاتلوں میں شمار ہو کر نمونہ عبرت بنتا، الفاظ کے صحیح استعمال سے نہ صرف بال بال بچ گیا، بلکہ جولیس سیزر سے بڑا ہیرو تسلیم کیا گیا۔ اگر بروٹس اس وقت خالص مشرقی انداز میں یہ کہتا کہ

"رومنو! تمہیں دیوتاؤں کا واسطہ۔ میری گذارش سن لو۔"

یا یہ کہتا "میرے دوستو! سو فیصدی کامیاب حکومت کی خوش خبری ۔!"

تو شاید منبر کی آخری سیڑھی سے زندہ واپس نہ اتر سکتا۔

اب ہم نے نیویارک کے جواب یعنی سیاٹل کا رخ کیا جو شمال مغربی امریکہ میں بحر الکاہل کے ساحل پر واقع ہے۔ یہیں بوئنگ کمپنی کے کارخانے ہیں۔ جہاں پی آئی اے کو بوئنگ جیٹ ۷۲۰ بی خریدنا تھا۔ رات کے

اور اندھیرے میں طیارے سے سیاٹل کا نظارہ کچھ کم دلفریب نہ تھا۔ یہ پورا شہر کیس کیڈ کی پہاڑیوں پر تعمیر ہے یہ پہاڑیاں ۲۲ میل لمبی جھیل واشنگٹن کو اپنے حصار میں لئے ہوئے ہیں۔ شہر اپنے چھوٹے چھوٹے رنگین مکانات کی وجہ سے پریوں کی بستی معلوم ہوتا ہے۔ پھر واشنگٹن جھیل میں ان کی روشنیوں کی جھلملاہٹ ایک حسین خوابی تصور سے کم نہیں۔۔!

جنازہ کمپنی کی مُبارکباد

نیویارک کی سردی میں دانتوں کا سازینہ عام تھا، لیکن یہاں اتنی سردی نہ تھی اس لئے گرمی سے عرق پودینہ نکلتا ہوا معلوم ہوا۔ ہم اپنے میزبان کی موٹر میں بنجامن فرینکلن ہوٹل کی طرف چلے تو سڑک پر دُور دریہ اشتہارات کے بورڈ نظر آئے۔ یہ اشتہارات بہت دل چسپ تھے، خاص طور سے روشن اشتہارات دنیا کی طرح گھومتے نظر آئے۔ اسی اثنا میں سڑک پر ایک بورڈ نظر آیا۔ جس پر لکھا تھا۔ "کولمبیا جنازہ کمپنی آپ کو نئے سال کی مبارکباد پیش کرتی

ہے۔" یہ پیغام مسرت بہت فکر انگیز تھا۔ کیا یہ مبارکباد اس لئے تھی کہ آپ گذشتہ سال اس جنازہ کمپنی کے ہاتھوں بال بال بچ گئے۔ یا اس مبارکباد میں یہ دھمکی پوشیدہ ہے کہ اس سال کے اختتام پر آپ کی خیر نہیں۔ یا یہ پُرخلوص تہنیت ان لوگوں کے لئے تھی جو زیادہ سے زیادہ عزیز تریب، مار کر کولمبیا جنازہ کمپنی کو پہنچاتے رہے۔

امریکہ میں جنازہ کمپنیوں کا کاروبار بہت زرخیز ہے کیونکہ جنازہ گھر کی بجائے کمپنی کے شوروم میں رکھا جاتا ہے۔ لاش کے لباس، زیور، اور نمائش کی مدت کے لحاظ سے اخراجات بھی ہوتے ہیں یہ اخراجات ۲ ہزار روپے سے لیکر ۵ ہزار تک ہوتے ہیں۔ ہم نے پھر اس کولمبیا جنازہ کمپنی کا شوروم اور دفتر بھی دیکھا، جتنی آرائش اور سال نو کی خوشی میں جس قدر روشنی یہاں تھی، اتنی کہیں نہ تھی،

ہمارے ملک میں صرف عاشق کا جنازہ دھوم سے نکلتا ہے مگر یہاں تو "بے دفنت کے پاپا"، اور خواہ مخواہ کسی کا جنازہ بھی باجے تاشے سے اٹھتا ہے۔

رات کو ہم ایک عالیشان ہوٹل میں کھانے پر مدعو تھے یہ ہوٹل بہت بلندی پر تھا، اس لئے یہاں سے شہر کا وہی دلفریب نظارہ تھا جو طیارے سے نظر آیا تھا، دعوتی کمرے میں مشرقی ماحول پیدا کرنے کے لئے جابجا شمعیں روشن تھیں، اور میزبانی کے فرائض جاپانی لڑکیاں ادا کر رہی تھیں یہاں بہت لوگوں

سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور اس انکشاف سے سخت حیرت ہوئی کہ شاذ و نادر لوگ پاکستان کے نام سے آشنا ہیں۔ ایک خاتون نے ہم سے یہ بھی دریافت کر ڈالا کہ پاکستان میں بڑی سڑکیں ہیں یا نہیں۔ اور کیا وہاں لوگ بجلی کے استعمال سے واقف ہیں۔؟

انہیں ہمارے کسی بڑے سے بڑے آدمی کا نام معلوم نہ تھا۔ البتہ بشیر ساربان کے نام پر سب واقف کارانہ انداز میں کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو پاکستان کو ریگستان اور ساربانوں کی بستی سمجھتے تھے جب ان سے پاکستان کی ترقیوں کا ذکر کیا گیا تو وہ تصویر حیرت بن گئے۔ ان سوالات سے مجھ پر مایوسی کے دورے پڑنے لگے۔ اور اب میں سانس روکے ہوئے ایک آخری سوال کا منتظر تھا۔ لیکن یہ انتظار طول کھینچتا گیا۔ میں اب تک حیران ہوں کہ یہ سوال کیوں نہیں کیا گیا۔ وہ آخری سوال۔ یعنی۔ "آپ کاٹتے تو نہیں۔؟"

ہمارے ایک شریک سفر جنہیں ہم ان کے قد اور گفتگو کی طوالت کی وجہ سے "لائٹ ہاؤس" کہتے تھے، بادشاہوں سے بنیانوں تک، گھوڑوں سے گوبھی کے پھولوں تک، اور موتیوں سے موچیوں تک ہر موضوع پر گفتگو۔ گفتگو تو کیا تقریر کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ اگر کوئی درمیان میں ٹوک دے کہ سکندر اعظم بادشاہ کا نہیں، ایک مشہور بنیان کا

نام ہے یا یہ کہ جاپان کے موتی نہیں، بلکہ موچی مشہور ہیں اور گوبھی کا پھول اپنے کوٹ کے بٹن ہول میں ہٹلر نے نہیں بلکہ مسولینی نے لگایا تھا، تو وہ تردید نہ کرتے اور پھر دوسرے موضوع پر اظہارِ خیال تو کیا وبال جان بن جاتے۔ جب کوئی جزبز ہو کر ان کی طرف دیکھتا تو وہ مجرمانہ مسرت سے ہنستے، اور دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کی پور کو انگوٹھے سے دبا کر اپنی چھوٹی سی مونچھ کی نوک کو ٹھوکا دیتے۔ شاید یہ خودکار عمل ان کے باطن میں "شاباش" کا ترجمہ تھا۔

بہرحال اس وقت وہ بہت کام آئے، اور ان خاتون سے گفتگو شروع کی، جو پاکستان کے متعلق ہوش ربا سوالات کر رہی تھیں مسٹر لائٹ ہاؤس نے ان خاتون سے پوچھا۔

"آپ نے جو دیکھا ہے۔؟"

"ہاں!" خاتون نے پریشان ہو کر کہا۔

"آپ کے شہر میں بھی جو ہے؟"

"ہاں کیوں نہیں!" خاتون نے جھنجھلا کر کہا۔ "وہ خود میرے گھر میں ہے۔!"

"اچھا! (حیرت سے) آپ کے گھر میں ہے۔؟" مسٹر لائٹ ہاؤس نے چکرا کر کہا۔

"ہاں ہاں میرا باورچی ہے۔!"

مسٹر لائٹ ہاؤس "وو" نہیں بول سکتے تھے، اس لئے وہ زو (یعنی چڑیا گھر) کو برابر جو (یعنی یہودی) کہہ رہے تھے۔ مسٹر لائٹ ہاؤس چڑیا گھر کے تصور میں کھو گئے تھے، اور وہ محترمہ دل ہی دل میں اپنے یہودی باورچی پر خفا ہو رہی تھیں جو اتنی اچھی دعوت میں اتنی دیر تک خواہ مخواہ موضوع گفتگو بنا ہوا تھا۔

بوئنگ کمپنی کے مختلف کارخانوں کے معائنے کے بعد ایک دن سیر کے لئے مقرر ہوا، اور ہم نے کیس کیڈ کی خوبصورت پہاڑیوں کا گشت کیا مردوں، عورتوں، اور بچوں کو برف پر پھسلتے ہوئے دیکھا اور سنو کو لما کے آبشار پر گئے جو ۳۰۰ فیٹ بلند ہے یہ آبشار نیاگرا آبشار سے اونچا ہے۔

قطبی روشنیاں

۲۹ر دسمبر ۱۹۶۱ء کی شام کو بوئنگ جیٹ ۷۰۷ کی حوالگی کی رسم ادا ہوئی اور اب ہم لندن کی طرف رواں دواں تھے پورے طیارے میں گہری خاموشی تھی، کیونکہ اب واپسی کا سلسلہ تھا۔ بعض چیزوں کے نہ خریدنے کا افسوس اور بعض اشیاء کو خریدنے کے رنج کے ساتھ بعض سستے نادرات خریدنے کی خوشی دلوں میں ہیجان پیدا کر رہی تھی، اتنے میں جہاز کے کپتان نے اعلان کیا کہ ہم قطبی علاقے سے لندن پہنچیں گے اس وقت ہم گرین لینڈ

پہنے گذر رہے ہیں، تھوڑی دیر بعد آپ ان مشہور قطبی روشنیوں کو دیکھ
سکیں گے جو سورج کے انعکاس سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس اعلان سے تمام
مسافروں میں کھلبلی مچ گئی، اور سب کھڑکیوں سے پیوست ہو گئے ہمیں
دائیں جانب ایک بڑا سا چاند نظر آیا یہ چاند ہمارے چاند کی طرح نہ تھا بلکہ
پپیتے کی پھانک کی طرح معلوم ہوتا تھا یہ نصف چاند بیحد داغدار تھا
اگر اس داغدار شے کے حاشیے میں چمک نہ ہوتی تو یہ چاند نہ معلوم ہوتا
طیارے کے نیچے لق و دق برفستان کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور ہمارے
سامنے وہ مشہور قطبی روشنیاں نمودار ہو رہی تھیں۔ جن کا چرچا سنتے
آئے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے زمین کے پیالے کی کگر کے پاس
چند سرچ لائیٹس چھپا دی گئی ہیں۔ بدلتی ہوئی روشنی کے یہ عظیم فوارے
عباسی تلوار کے پھل سے کسی قدر مشابہ تھے یعنی نیچے سے موٹے اور قوس
کی تکمیل کے دوران پتلے ہوتے ہوئے ایک نوک پر ختم ہو جاتے
تھے۔ زمین کے سینے سے یہ روشنیاں نکل کر افق کی پہنائیوں پر رقص
کرتی کسی ان دیکھے مقام تک چلی جاتی ہیں۔ چاندنی رات کے باوجود
ان کی جھلا جھل آنکھوں کو متوجہ کئے ہوئے تھی۔

لندن ایئرپورٹ پر ایک شریک سفر کو جن کی کالے فریم کی عینک
اور موٹی سیاہ مونچھوں میں اشتہاری کشش تھی، رازدارانہ انداز میں

ایک طرف بلایا، اور ان سے پوچھا۔ "آپ کے ساتھ زیادہ وزن تو
نہیں ہے۔"

"نہیں تو" انھوں نے سخت گھبرا کر کہا۔

"دیکھئے!... میں نے کہا۔ لندن کے کسٹم والے مونچھیں یونہی نہیں
جانے دیتے!"

"کیا مطلب...؟"

"آپ کو مونچھوں پر ٹیکس دینا ہوگا!"

وہ چکرا گئے اور تیزی سے اپنے ایک ساتھی کے پاس جا کر انہیں
یہ خبر وحشت اثر سنائی۔ اس کے بعد جو قہقہے بلند ہوئے تو وہ سخت
نادم ہوئے۔ انھوں نے مجھے ایک بال پائنٹ قلم تحفے میں دی، اس
واقعہ کو اپنے سفرنامے میں قلمبند کرنے کیلئے یا اسے قلمزد کرنے کیلئے
واللہ اعلم۔؟

لندن میں شدید برف باری شروع ہو گئی تھی۔ اتنی برف
ساٹھ، ستر سال کے بعد پڑی تھی۔ ایسی برف کہ بازار سنسان ہو گئے
بسیں برف میں پھنس گئیں، مکانوں کے دروازوں کے آگے برف کی
پردہ دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ ہر لندنی خاکسار معلوم ہونے لگا دمشق
میں قحط کی وجہ سے عشق کے پاپڑ بن جانے کا قصہ سنا تھا، لیکن لندن

میں محبت کا برفاب اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ۳۱ دسمبر کی رات جوان
ہوئی تو سخت سردی کے باوجود دلوں میں گرمی پیدا ہوئی اور لوگ
نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لئے ٹریفلگر اسکوئیر کی طرف رقص
کرتے اور گاتے ہوئے جانے لگے۔ پکاڈلی سرکس پر بیچ سڑک پر تاج
برطانیہ اور دوسری آرائشی روشنیاں آویزاں تھیں۔ ان روشنیوں پر ۶۵
ہزار پونڈ خرچ ہوئے تھے، جو دکان داروں کے چندے سے جمع ہوئے
تھے۔ آہستہ آہستہ ہم ٹریفلگر اسکوئیر پہنچے جہاں پرانا سال
نئے سال سے اور پرانے مرد نئی لڑکیوں سے مل رہے تھے۔ بارہ
بجنے میں ۵ منٹ رہ گئے تھے ہر منٹ کے ساتھ گیتوں کی گونج
بڑھتی جا رہی تھی جب ٹھیک بارہ بجے تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور لڑکیاں
"مجھے پیار کرو" کہتی ہوئی دوڑیں۔ بعض دوڑتی ہوئی ٹریفلگر اسکوئر
کے حوض میں کود پڑیں۔ مبارکبادیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ہم
اپنے ہوٹل واپس آگئے۔

صبح میں نے اپنے دوست مسٹر تقی سید کے ساتھ بکنگھم پیلس کا
رخ کیا۔ اس محل کے صدر دروازے میں داخل ہوتے ہی ملکہ وکٹوریا
کا مجسمہ نظر آیا۔ مجسمے کے سنگین منبر کے اطراف ایک حوض ہے۔ جس کی
چوڑی منڈیر پر نوآبادیوں کے علامتی بت نظر آئے۔ اس میں

ہندوستان کا ہاتھی بھی شامل تھا۔ دو طرفہ باغ برف سے پٹا ہوا تھا۔ اور
یہاں کے قدیم فلک بوس درختوں میں ہوا کی خوفناک سرسراہٹ مکالموں
کا انداز لئے ہوئے تھی ذرا سے غور سے جملے کے جملے سمجھ میں آنے لگے۔ پہلے
جھکڑ نے کہا۔ "یو ٹو" (تم ۲ ہو۔؟) دوسرا جھکڑ چلا تو آواز آئی: "ہو آر
یو"؟ (تم کون ہو؟)

ہم اس بولتے ہوئے محل سے جلد نکل گئے اور ڈاؤننگ اسٹریٹ
میں وزیر اعظم کا مکان دیکھ کر دریائے ٹیمس کی طرف چلے، یہیں برطانوی
پارلیمان، ویسٹ منسٹر ایبے، اور مشہور گھنٹہ گھر بگ بن ہے۔

بوڈیسیا

میں دریائے ٹیمس کا نظارہ کرنے کیلئے پل پر گیا تو وہاں مجھے ملکہ بوڈیسیا کا مجسمہ نظر آیا۔ ایک حسین و جمیل خاتون، رومن رتھ پر سوار برطانوی پارلیمان اور بگ بن کی طرف منہ کئے کھڑی ہیں۔ ہمت اور جواں مردی کے آتشیں تصور کی طرح۔ ویسٹ منسٹر ایبے اور دوسری نوکیلی عمارتوں کو دیکھنے سے جو تعمیری رعب پڑتا ہے اسے بوڈیسیا کا مجسمہ کسی حد تک کم کر دیتا ہے نیچے ٹیمس کی بے چین موجیں اور کنارے برف سے لدے

ہوئے اسٹیمر تھے۔ کچھ دور ٹیمس کہر کے ایک بھیانک غار میں کھو گئی تھی، اسی طرح جیسے چند صدیوں پہلے لندن تاریخ کے گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔ بوڈیسیا کا مجسمہ اس وقت کی یادگار ہے جب اس بہادر ملکہ نے فولادی رومنوں کے وحشیانہ حملے کو روک کر اپنے وطن کی ناموس کو بچانا چاہا تھا۔ بوڈیسیا کا شوہر شاہ پراسوٹاگس شہنشاہ نیرو کے زمانے میں برطانیہ کا بادشاہ تھا۔ پراسوٹاگس رومنوں سے خائف تھا جب اس کا آخری وقت آیا تو اس نے اپنی دولت کو اپنی دو بیٹیوں اور نیرو میں تقسیم کرنے کی وصیت کی۔ لیکن جب بوڈیسیا تخت و تاج کی مالک بنی تو نیرو نے اس وصیت کی ذرا پرواہ نہ کی اور بوڈیسیا کی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ بوڈیسیا نے مردانہ وار اس حملے کا جواب دیا اس کے پرچم کے نیچے اس علاقے کے لوگ بھی جمع ہو گئے جو رومنوں کی سخت گیری اور بھاری ٹیکسوں سے جاں بہ لب تھے کہا جاتا ہے کہ جنگ لندن اور چیسٹر کے درمیان ہوئی تھی، اور آخر کار بوڈیسیا نے زہر کھا لیا۔ میں نے بوڈیسیا کے چہرے کی طرف احترام سے دیکھا، وہ غور سے بگ بن کو دیکھ رہی تھی جو سریلی تانوں میں گیارہ بجا رہا تھا، لیکن گھنٹے نے صرف نو بجائے۔ لندن کی شدید برف باری کی وجہ سے کچھ برف گھنٹے کی مشین میں داخل ہو گئی تھی۔ میں نے پلٹ کر ایک نظر بگ بن کی طرف دیکھا اور پھر بوڈیسیا کی طرف۔

"ملکہ بوڈیسیا! کیا تم اس وقت بھی یہیں کھڑی ہوئی برطانوی پارلیمان کے ایوانوں

کو دیکھ رہی تھیں جب آئیسینی (برطانیہ) سے زیادہ عظیم ملک برطانیہ کی نوآبادیوں میں شامل ہو رہے تھے۔،،

ملکہ بوڈیسیا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، یہ آنسو نہ تھے، ایک پتھر کے مجسمے کی آنکھ میں آنسو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے ہاں ان کے پپوٹوں پر جو برف جمی تھی وہ موسم کے گرم ہو جانے سے بہہ نکلی ملکہ بوڈیسیا کیا کر سکتی تھیں۔؟ برطانوی پارلیمان کے دار الامراء اور دار العوام کے گرم گفتار بوڈیسیا کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھتے تھے مجھے معاً یاد آیا کہ برطانیہ کی ایک اور ملکہ وکٹوریا بھی تھیں، جو بکنگھم پیلس کے سامنے نوآبادیوں کے حصار میں متمکن ہیں اور میں سوچنے لگا کہ ان دونوں میں سے برطانیہ کی حقیقی ملکہ کون تھی۔ وکٹوریا یا بوڈیسیا۔؟

میں بے جان قدموں سے پل پر ٹہلنے لگا، ایک طرف گلڈ ہال کی عظیم عمارت تھی جس کے تین چوتھائی حصے کو بادلوں نے کم نظر بنا دیا تھا اور سامنے مشہور و معروف دریائے تھیمس کی بے تاب موجیں تھیں میں نے پل کے کٹہرے کی آہنی گرفت کا سہارا لیا۔ اس پر بے شمار نام کھدے ہوئے تھے عجیب غریب نام، ان لوگوں کے نام جو اپنے وطن میں گمنام اور دیارِ غیر میں لازوال! جب تک تھیمس کی موجیں اپنے راستے پر چلتی رہیں گی یہ پل موجود رہیگا۔ اس وقت تک یہ نام برقرار رہیں گے، تاہم یہ تسکین بھی بہت ہے۔

ویسٹ منسٹر

میں آہستہ آہستہ ویسٹ منسٹر کے عظیم دروازے پر پہنچا۔ قدیم طرز کا بہت بڑا دروازہ! صرف عیسائیوں کے لئے اتنا بڑا دروازہ! اس دروازے کو دیکھکر تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پوری انسانیت کے لئے بنایا گیا ہوگا۔ دروازے کی ڈیوڑھی میں داخل ہو کر میں یہ فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ دو رخی طویل سنگ بستہ غلام گردشوں میں سے کس کا انتخاب کروں۔ میں گویا عجوبوں کی دکان کے سامنے کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میرے لئے کون سا عجوبہ موزوں رہے گا۔ آخر کار میں نے چند

اطالوی سیاحوں کے پیچھے چلنا شروع کر دیا جو ایک رہبر لڑکی کو ساتھ لے کر آئے تھے۔ ویسٹ منسٹر۔ ایک بے معنی لفظ ہے لیکن دسویں صدی عیسوی کی دستاویزات میں اس کے معنی "خوفناک جگہ" ملتے ہیں۔ مشہور ہے کہ اس مقام پر ایک حسین وجمیل دوشیزہ ایلین کی لاش ٹیمس کی موجوں کے سہارے آ کر رک گئی تھی۔ اس وقت سے اسے ویسٹ منسٹر کہتے ہیں۔ میں اس وقت بڑے گرجا میں داخل ہو چکا تھا۔ شیشہ کاری اور صناعی کے نادر نمونوں کے باوجود مجھے حبس دوام کے احساس نے بھینچ رکھا تھا۔ مجھے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ میں ایک پنجرے میں بند ہوں جس میں ماضی ایک بھوکے شیر کی طرح گرج رہا ہے۔ حال اور مستقبل کے فرشتے باہر کھڑے میری حالت پر آنسو بہا رہے ہیں۔ میرے ارد گرد برطانیہ کے تمام بادشاہ، شوخ وشنگ شاہی لباسوں میں ملبوس، قاتلانہ ہتھیاروں سے آراستہ، میرے پہلو میں بھیانک تابوت، لاشیں اور سامنے ناگہانی سیاہ عبارتیں جن کے حروف لمحہ بہ لمحہ جلی اور نمایاں ہوتے چلے جاتے تھے۔ میری توجہ تھک گئی، اور میں نے آنکھیں بند کر کے کہا۔ یا خدا میں اس جگہ بصیرت تلاش کر رہا ہوں جہاں کے رہنے والے نور بصارت سے محروم ہو چکے ہیں۔

میں تیز قدموں سے "گوشہ شعراء" کی طرف چلا گیا۔ یہاں لارڈ ٹینی سن، رابرٹ براؤننگ، کیٹس، شیلے، برنس، سیموئل ٹیلر، ملٹن

ورڈس ورتھ، رابرٹ سدے اور ڈاکٹر جانسن کی یادگاریں ہیں۔ یہاں پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ میں زندوں کی محفل میں ہوں۔

"ہلو!" ڈاکٹر جانسن نے کہا۔ "چھوٹے لڑکے! تمہارے ملک میں دانشوروں کا کیا حال ہے؟"

"اچھا حال ہے۔ فی الحال ان کے لئے ایک ہال بنانے کی تجویز ہے جس میں نظم، غزل، افسانہ اور مضمون سناتے وقت انھیں سننے والوں سے ہول نہ ہو۔"

"تمھیں کیا وظیفہ ملتا ہے؟" ڈاکٹر جانسن نے مشفقانہ انداز میں دریافت کیا۔

"ابھی تو وظیفہ پڑھ رہا ہوں!"

"بھائی!" جانسن نے آہ بھر کر کہا۔ "ہمارا دور تو بڑی ناقدری کا دور تھا۔ میں ۲۸ سال کی عمر سے ۴۸ سال کی عمر تک ادیب ہونے کے جرم میں مکھن ڈبل روٹی سے محروم رہا جب میری ڈکشنری چھپنے لگی اور اس کی شہرت سن کر لارڈ چیسٹر فیلڈ نے اپنے نام انتساب کی اجازت دیدی تو میں نے انہیں خط لکھا۔

"میرے آقا! سات سال سے میں آپ کی ڈیوڑھی میں آپ کا انتظار کرتا رہا۔ ہر شام کو میں آپ کے دروازے سے مایوس جاتا رہا ہوں۔ اس عرصے میں میں طرح طرح کی دشواریوں سے، جن کی شکایت بے سود ہے، نبرد آزما ہوا اور اس کتاب کو اشاعت کی منزل تک لایا۔ اس سلسلے میں نہ دست تعاون بڑھا، نہ ہمت افزائی کا کوئی لفظ نکلا اور نہ کسی پرجوش مسکراہٹ کا سہارا ملا

میرے آقا! کیا وہ شخص مربی اور سرپرست ہو سکتا ہے جو طوفانی لہروں میں کسی کی جان بچانے کی کوشش نہ کرے اور وہ خود ہی بہتا ہوا ساحل پر آجائے تو امداد کا ہاتھ بڑھائے۔ آپ نے میری محنت کی جو قدر کی ہے اگر یہ ذرا پہلے ہوتی، کچھ اور مشفقانہ ہوتی تو مجھے اس قدر افزائی کا لطف آتا۔ اب تو مجھے سب جانتے ہیں اور اس کی چنداں ضرورت نہیں۔"

"آپ کے اس خط کے بعد تو مزے آگئے ہوں گے۔" میں نے کہا!

"نہیں جناب" جانسن نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "اس خط کا اثر پورے سات سال بعد ہوا اور مجھے بادشاہ کی طرف سے ۳۰۰ پونڈ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا۔"

"بہر حال ڈاکٹر صاحب!" میں نے کہا۔ "آپ بادشاہوں کے زمانے کے تنکا تھے اس لئے آپ کو اتنی مصیبت جھیلنی پڑی۔ ہم عوامی دور کے لوگ ہیں جبکہ دانش صبح کے ناشتے کی طرح اہم ہے۔ ہمارے ادب کا ہر شائق شاہ برطانیہ سے کم نہیں!"

کھوکھلے انسان

ایک رات کو میں پکاڈلی سرکس سے ٹہلتا ہوا اپنے ہوٹل کی طرف چلا مجھے یقین تھا کہ میں آسانی سے گرین پارک کے مقابل ہاف مون اسٹریٹ پہنچ جاؤں گا جہاں وہ ہوٹل ہے پھر مجھے ہوٹل کا شب چراغ نام بھی دور سے نظر آجائے گا۔ اسی خیال سے میں سنسان شاہراہ پر جہاں کے نارنجی قمقمے ہلکی ہلکی برف باری میں رنگین دھبے معلوم ہو رہے تھے، پورے اعتماد سے چلتا رہا۔ اس دوران میں کبھی کبھی قدم راہ پر بکھرے ہوئے برف کے سخت

ٹکٹ میری ٹھوکر سے شور مچاتے سڑک پر جا گرتے تھے ورنہ چاروں طرف مکمل
خاموشی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں کسی فاتح کے ساتھ کسی خالی شہر
میں داخل ہو رہا ہوں۔ گرین پارک کے علاقہ میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ کسی
بھی مکان میں روشنی نہیں اور وہ تمام نشانیاں جو میں نے ہوٹل تک پہنچنے کیلئے
یاد کر رکھی تھیں، رات کی سیاہی اور برف کی سفیدی میں گم ہو چکی ہیں۔ بہر حال
یہ ہمت کہ ہوٹل کا نام روشن ہے مجھے کشاں کشاں لئے جا رہی تھی۔
گرین پارک کے سامنے کئی گلیاں تھیں جن میں سے ایک ہاف مون اسٹریٹ
تھی۔ ان سب گلیوں میں اندھیرا تھا اور ہوٹل کی بیرونی روشنیاں
بھی خاموش تھیں اس لئے یہ اندازہ سخت مشکل تھا کہ ان میں سے کس
گلی میں کونسی عمارت وہ ہوٹل ہے جہاں میرا قیام ہے۔ چاروں طرف
ایک ہو کا عالم تھا، اور برف باری تیز ہونے لگی تھی۔ میں اس الجھن
میں گرفتار تھا کہ یہ رات مشکل کشا کے انتظار میں یونہی تو نہیں گذر جائیگی
اتنے میں ایک خاتون دائیں ہاتھ میں سیاہ بیگ اور بائیں ہاتھ میں
چھتری لئے تیزی سے آتی ہوئی نظر آئیں۔ شدید سردی کے باوجود
ان کی پنڈلیاں ننگی تھیں۔ کپکپاہٹ کی وجہ سے پیر بے قابو تھے۔ میں
نے ان سے مدعا بیان کیا لیکن وہ نفی میں گردن ہلاتی چلی گئیں اور
ان کی رفتار میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ اس کے چند منٹ بعد ایک گلی سے

ایک لحیم شحیم صاحب اسی تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نکلے۔ میں نے انہیں
ٹوکا تو رفتار میں ان کی بھی فرق نہ آیا لیکن انہوں نے مجھے راستہ بتا دیا۔
پاکستان کے ایک شہر میں، میں ایک مرتبہ راستہ بھول گیا تھا اور ایک
صاحب سے رہبری چاہی تو انہوں نے مجھے نہ صرف اس مقام تک پہنچایا بلکہ
پاسپورٹ کے لئے ضروری کوائف بھی دریافت فرمالئے تھے مثلاً کس سنہ
میں پیدا ہوئے، کیا کرتے ہیں، شادی شدہ ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو کیا نتیجہ
نکلا۔ اگر نہیں ہیں تو کیا نتیجہ ہوگا۔ بہر حال پاکستان اور انگلستان جذباتی
زندگی کے دو کنارے ہیں۔ ایک طرف احساس کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے
اور دوسری طرف احساس کے سود و زیاں پر بل پاس ہو رہا ہے۔ انگریز
سولہویں اور سترہویں صدی کے دوران ایک جذباتی قوم تھی۔ ادب اور
بالخصوص ڈرامہ قوم کے خمیر کا آئینہ دار ہوتا ہے چنانچہ شیکسپیئر اور ان کے
وارثوں کے ہاں زندگی کا شور و غل اپنے تمام زیر و بم کے ساتھ موجود ہے
انگریز انیسویں صدی میں بھی زندگی کی ہماہمی سے دو چار تھے کیونکہ چارلس ڈکنس
کے ہاں آنسوؤں اور قہقہوں کی فراوانی ملتی ہے لیکن گذشتہ ستر برس
سے یہ ایک ایسی قوم بن گئی ہے جس میں احساس کی شدید کمی ہے۔ آج سے سولہ
سال پہلے جب انگریزوں کا پھریرا ہندوستان میں لہرایا تو انہوں نے
فاتح رومنوں کا روپ دھار لیا اور اپنی زندگی کے اس ڈرامے کو بعد میں

خود ہی حقیقت سمجھنے لگے۔ ان کے اس رعب داب کا ہندوستان میں بہت اثر ہوا۔ انگلستان میں ہندوستان کے حکمرانوں کے انداز، اُن کے جذبات سے عاری چہرے اور عظیم فاتحوں کی سی خاموشی فیشن بنتی چلی گئی۔ اصلی زندگی ان سے کوسوں دُور اور بناوٹ جزوِ زندگی بنکر رہ گئی۔ انگلستان اب امریکہ سے زندگی مستعار لینے کی ناکام کوشش میں مصروف ہے۔ لندن میں سیاحوں کی دلچسپی کے بہلانے آئے دن نائٹ کلب کھلتے جاتے ہیں۔ مگر یہاں بھی ہنسی کچھ دبی دبی سی اور محبت کچھ رسمی رسمی سی معلوم ہوتی ہے۔ موشکو نے آج سے ۲۴۴ سال پہلے کہا تھا "انگلستان میں غیر معمولی کام ہوتے ہیں لیکن ان سب کا آخری نتیجہ پیسے کمانا ہے، فرانس میں جو غیر معمولی کام ہوتے ہیں، ان کا آخری نتیجہ پیسے خرچ کرنا ہے۔ فرانس میں ہر ایک میرا دوست بن جاتا ہے اور انگلستان میں میرا کوئی دوست نہیں بنتا۔"

انگریزوں کی دید کا ایک اور پہلو بھی ہے جو بعد کے زمانہ میں بسمارک نے محسوس کیا۔ اس کے خیال میں انگریز فرد کی حیثیت سے اکثر و بیشتر نفیس، ایماندار اور بہادر آدمی ثابت ہوتا ہے۔ اس سے کاروباری تعلقات یا عام مراسم بہت خوش گوار ثابت ہوتے ہیں لیکن انگریزی سیاست، منافقت اور بیرحمی کا مرکب اور عام خطرہ ہے۔

اس کے بعد برناڈ شا نے عام خطرے کا احساس کرکے اپنی ایک تقریر میں

کہا تھا کہ مغربی تہذیب نے اقوام مغرب کو ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ گذشتہ پچاس برس میں یورپ کے اکثر دانشوروں نے ایسے مبہم اشارے کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگلستان کے رہنے والے کا اندرون اور بیرون ہم آہنگ نہیں۔ فاناٹی۔ ایس۔ ایلیٹ پہلا شاعر ہے جو اس نکتے سے آشنا ہے۔ اس کی نظم ملاحظہ کیجئے:۔

ہم کھوکھلے انسان ہیں
ہم پھونس بھرے انسان ہیں
ہم ایکدوسرے کی طرف بغل گیر ہونے کو بڑھ رہے ہیں مگر ہمارے دماغوں میں گھاس بھری ہوئی ہے، افسوس!
ہماری بے جان آواز
جب ہم ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہیں۔
بے اثر اور بے معنی ہے
جیسے خشک گھاس میں ہوا کی سرسراہٹ
یا ٹوٹے شیشوں پر چوہوں کے پیروں کی چاپ!

تصویر خانہ لندن

میں دوپہر کو ٹیکسی میں بی بی سی کے دفتر پہنچ گیا یہاں مسٹر اطہر علی، مسٹر تقی سید اور مسٹر یحییٰ سید میرے منتظر تھے۔ پاکستانی پروگرام سننے کے بعد ہم ٹریفالگر اسکوائر میں نیشنل گیلری پہنچے۔ نیشنل گیلری کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے مجھے ویسٹ منسٹر ایبے کے "مطالعے" کا خیال آگیا اور ایک امریکی مصنف کا جملہ جس کا نام یاد نہیں، بے اختیار ذہن میں آیا "لندن میں نادر، قریب اور دنیا کے گوشے گوشے سے لوٹے ہوئے انوکھے خزانے ہیں۔" میں سکرتا ہوا ایوان میں داخل ہوا تو وہاں بیچوں بیچ "شہرت" کا مجسمہ تھا ایک فرشتہ نفیری بجاتا ہوا پرواز کر رہا ہے

یہ بہت خوبصورت مجسمہ ہے۔ پہلے ہم نے کلاسیکی اور رومانی دور کی تصاویر دیکھیں جن میں داستانوں کی شخصیتیں بڑے رعب داب سے متمکن تھیں۔ خطوط کی ہم آہنگی اور رنگوں کی آمیزش عروج کمال پر تھی۔ یورپی حسن کاری کے ادوار کا تعین مشکل ہے تاہم انقلاب فرانس اور بعد میں سائنس اور فنی اختراعات کی روزافزوں ترقی نے حسن کارانہ احساس میں جو غیر معمولی تغیر پیدا کیا اس سے کچھ قیاسی دور متعین ہو سکتے ہیں اس دشواری کا بڑا سبب یہ بھی تھا کہ نئی نسل کے فنکاروں نے پرانی نسل کی بے جا ضد میں فن کی ہیئت میں جابرانہ تبدیلیاں کیں یا اپنے تصورات کو پیش کرنے میں اپنی شخصیت کا بھرپور تاثر پیش کیا اب ہم ان فنکاروں کے مرقع دیکھ رہے تھے جو مصنوعی انسانوں اور خیالی داستانوں کے پرستانوں سے دور اپنی اصلی آنکھ سے قدرت کی دلربائی کا مطالعہ کر رہے تھے ان مرقعوں میں شکل، رنگ اور روشنی کا امتزاج تھا اس کے بعد کی تصویروں میں روشنی نے اہمیت حاصل کی۔ ان مرقعوں کا تعلق "تاثریت" سے ہے جس کا بانی مانے سمجھا جاتا ہے مانے نے سب سے پہلے ایک مرقع بنایا تھا جس کا عنوان "تاثیر" (IMPRESSION) تھا۔ اس دور کی تصویریں سرور انگیز ہیں لیکن یہ تحریک بھی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ کینوس پر روشنی زیادہ ہوتی گئی، خطوط معدوم اور رنگ اڑنے لگے اور اب تو یہ نوبت ہے کہ کینوس ہی کینوس نظر آتا ہے۔ میرے ایک دوست نے ایک تاثیری حسن کار کا واقعہ سنایا۔ ایک دن ان حسن کار صاحب نے چند دوستوں کو ایک کینوس دکھا کر پوچھا۔

"بتائیے! کیا دیکھا!"

"ہمیں تو کچھ نظر نہیں آتا" دوستوں نے کہا۔

"ہیں! آپ کو سبزہ زار پر گائے کھڑی ہوئی نظر نہیں آتی؟"

"گھاس کہاں ہے" دوستوں نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہ تو گائے کھا گئی" حسن کار نے جواب دیا۔

"اور گائے کہاں گئی؟"

"وہ اپنے تھان پر چلی گئی!" حسن کار نے کہا۔ بہرحال کینوس خالی رہ گیا۔

نیشنل گیلری میں تاثیریت کے دور سے متعلق سیزاں اور رینوا کے مرقع قابل دید ہیں۔ یورپی حسن کاری میں انقلاب فرانس سے پہلے ہر چیز اصل ہیئت میں دکھائی جاتی تھی اور ساز و سامان حسن کاری متعین تھے جس طرح ہماری شاعری میں بلبل کا ذکر ہو سکتا تھا چڑے کا نہیں، اسی طرح وہاں سڑک پر پڑے ہوئے ردی کے ٹین کو موضوع نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ سیزاں نے سب سے پہلے دیہات کی منظر کشی شروع کی، حالانکہ لوگ بادشاہوں، شہزادوں، عالیشان محلوں اور بے نظیر باغات دیکھنے کے عادی تھے۔ سیزاں کے خطوط کی وارفتگی اور رنگوں کی ہم آہنگی ایک قسم کی موسیقی سے کم نہیں۔ ان مرقعوں میں وہی دھمک محسوس ہوتی ہے جو عظیم شاعری کا خاصہ ہے۔

موسم خزاں کے ایک مرقع کے سامنے ایک دوشیزہ لال فراک پہنے تنہا کھڑی ہوئی تھی۔ ہم اسے دیکھتے ہوئے گزر گئے۔ جب واپس آئے تو وہ اسی طرح ٹکٹکی لگائے کھڑی تھی۔ ہمارے ایک دوست نے کہا:

"اس تصویر میں ایسی کیا خاص بات ہے؟"

"انھیں موسم بہار کا انتظار ہے۔!" ہم ہنستے ہوئے نیشنل گیلری سے نکل آئے۔

۲ جنوری سنہ ۱۹۶۲ء کی صبح کو ہم پی آئی اے کے نئے طیارے سے بوئنگ ۷۰۷ میں کراچی واپس ہوئے۔ اس طیارے نے تیز رفتاری کا اور راقم الحروف نے بڑے سفرنامے کو "چھوٹیانے" کا ریکارڈ قائم کیا۔

سفرنامہ

سنہ تحریر

چالو ادب

کہتے ہیں کہ انگریزی کا عظیم شاعر بائرن لنگڑا کر چلتا تھا۔ ہمارے ادبی بیرنوں نے شاید اسی روایت کی یاد میں محبوب کی "انگڑائیوں" کو "لنگڑائیاں" لکھنا شروع کیا۔ تو تتلے خیالات کے ہجوم اور بہرے جذبات کے شور و غل نے انھیں ایسا سرگرداں کیا ہے کہ وہ گونگے قلندر دل کے اشارات بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ڈیکوئنسی نے ادب کو صرف دو شقوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک وہ ادب جو ذریعہ علم ہے اور دوسرا وہ جو ذریعہ تحریک ہے

یہ تقسیم نہایت معقول سہی لیکن ڈیکو بنشی نے یہ فیصلہ تقسیم سے پہلے کیا تھا اور ادب پر نظرِ ثانی کے بعد دوبارہ تقسیم کا سوال پیدا نہ ہوا تھا۔ بہرحال اس تقسیم کے بعد ادب تین شقوں میں منقسیم ہو گیا۔ یہ تیسری شق "چالو ادب" کہلائے گی۔ چالو ادب قطب نما کی سوئی کی طرح دائمی لرزے میں مبتلا ہے اور ہر ایک — خواہ وہ ایک بے حال مجذوب ہو، یا دانش و بینش کا سرمہ لگانے والا کجکلاہ — اس ادب پر نظر پڑتے ہی ٹھٹھک جاتا ہے۔ اگر اس منزل سے گزر جائے تو خیر ورنہ کہیں گھور کر دیکھ لے تو مجذوب تعویذ فروخت کرنے اور کجکلاہ ٹوپی اتار کر سیٹی بجانے کا شغل شروع کر دیتا ہے۔

افسوس! کیا زمانہ آن لگا ہے۔ پہلے دل پر چوٹ لگتی تھی تو اچھا خاصا آدمی میر تقی میر بن جاتا تھا۔ مرزا غالب پیدا ہوئے۔ امر بیلا میں پل کر جوان ہوئے، اچھے خاصے تڑپتے ہوئے شعر — شعر کیا — مرغِ بسمل کہتے تھے۔ عمر ڈھلی۔ معقولیت کا زمانہ آیا تو چلتے چلاتے ؎

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

کہہ کر شاعری کے صدر دروازے میں تیغہ لگا دیا۔ شاعر کے دماغ کی بھٹی سلگ اٹھی، اور آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال کی پھلجھڑی بن گیا۔ دماغ پگھل پگھل کر شعروں کے سانچے میں ڈھلنے لگا۔ تو

شاعر پنجوں کے بل اٹھا اور باورچی خانے کی چمنی سے نکل بھاگا۔ اب کے محفل میں بائرن کی شاعری کم اور بےخبری زیادہ تھی۔ بائرن پیدائشی لنگڑا تھا۔ ہمارے شاعر کی پیدائشی شاعری تو فرار کی پریشانی میں ہاتھ سے چھوٹ کر بکھر گئی۔ صرف کتیبانی لنگ باقی رہ گیا تماشائی چیخے، بھائی! بائرن ایک گھنٹے تک لنگڑاتا تھا تو کیا ہوا، ایک بھیانک شعر تو کہتا تھا۔ تم برسوں سے لنگڑا رہے ہو اور ابھی تک اپنے وزن کے چکر میں پڑے ہوئے ہو، قدم آگے رکھو اور کچھ کہو تو سہی! اس پر چند شاعروں نے اٹھ کر کان کھڑے کئے۔ جب زیادہ شور ہوا تو بیٹھ کر "نظمانے" لگے۔ یہاں کی حسینہ جاں نثاری اور وفاداری میں تاج محل سے زیادہ مشہور ہے۔ کس نے دیکھا کہ قوم نے شاعر کی چشم و دل پر ڈاک خانۂ خطوط لاوارث کی مہر لگا دی ہے تو وہ بیچاری پریشان ہو گئی — وقت کے چھاون سے برسوں کا ٹپکا لگتا رہا۔ لیکن یہ لہکتا ہوا بلبل اب نہ تو شبنمی راتوں کے افسانے سناتا اور نہ گلابوں کے گیت گاتا — نفرت کی یہ بانسری تو پڈری کی طرح پھدک رہی تھی۔ حسینہ بے ساختہ باہر نکل آئی اور پھر آہستہ آہستہ "سلمیٰ" اور "عذرا" کا بہروپ لیکر نظموں کے قید خانے میں اپنے سر تاج کی سیر کرنے چلی آئی۔ اقبال

نے دیکھا تو ہنگامہ برپا کر دیا۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

۱۹۴۷ء آیا۔ داغِ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی ایک روٹی رہ گئی تھی۔ وہ ۱۴ر اگست کے یوم وصال پر آدھوں آدھ تقسیم ہوئی متروکہ جائدادیں، متروکہ انجمنیں، متروکہ رسالے اور متروکہ مرتبے۔ الاٹ بھی گئے۔ اور قبضائے بھی گئے۔

آخرکار "ساعت" کے بعد یکطرفہ میلوں نے "چالو ادب" کو جنم دیا ادبی بھاپ گاڑیاں پٹڑیوں پر جہاں کی تہاں کھڑی ہو گئیں ادبی ہاتھ گاڑیاں "خانہ رسن" کو نصب العین بنا کر تنگ و تاریک گلی کوچوں تک پہنچ گئیں۔ چالو ادب نہ دریائے فیض ہے اور نہ فیض دریا۔! یہ تو آج کے انسان کے جگر کی خرابی کا نتیجہ ہے۔ تمہید بہت طویل ہو چکی ہے۔ آئیے اب آپ ایک چالو ادب کے خالق کی واردات خود اس کی زبان سے سنیے؛

جناب والا۔! میری زندگی جب ندی کی طرح پرسکون تھی ـــ میں دن بھر لیٹا ہوا دوستوں کے سگریٹ پیتا۔ اور اس موضوع پر بحث کرتا رہتا کہ ـــ ہٹلر مسلمان تھا یا نہیں

لیکن ایک دن میری زندگی میں ہٹلر کی زندگی کی طرح ایک انقلاب آیا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب بی اے کی آنکھیں روزن دیوار زندان ہو گئیں۔ ان کی نگاہیں کامیابی کی کرنیں ثابت ہوئیں۔ ان کے علم و فضل کی بہت شہرت تھی۔ مجھے ایک گوہر نارشید پایا تو تعلیم کا شوق دلایا۔ اس کے بعد اپنے وطن عقیل شیخوپورہ میں ایک سال تک درس دے کر فارغ التحصیل فرما دیا۔

اب تک روٹی کھاتا تھا تو علم حاصل کرنے کی طاقت دو چند ہو جاتی تھی۔ جب علم حاصل ہو گیا تو اس کی جھلا جل روشنی میں روٹی کا قطر دنیا کے گلوب سے بھی بڑا نظر آیا۔ میں نے یعقوب صاحب سے ادب کے ساتھ عرض کیا۔ "حضور! اس نکتے کو سمجھنے سے بندہ قاصر ہے۔ روٹی کا مسئلہ ہر جگہ حاضر ہے۔"

استاد بڑے موقع شناس تھے، جھلا کر فرمایا۔

"نادان۔! ہر بات کو مسئلہ نہ بنا۔! عقل و دانش کے گھوڑے کو چابک لگا!"

میں نے زانو پہ ہاتھ مار کر ایک سرد آہ کھینچی اور عرض کیا؛

"استاد وقت بہت تنگ ہے اور آپ کا خادم ابھی تک ونگ ہے۔"

خوش ہو کر فرمایا، "ماشاء اللہ! ماشاء اللہ! لڑکے تو ہم سے بڑھ گیا۔ لے قافیے کے بادشاہ! واہ وا۔ واہ وا! اب تو یہ کر کہ پڑھ ایک ڈرامہ آغا حشر کاشمیری کا۔ اور لکھ ایک اور اسی طرح کا ڈرامہ — ہم اسے فروخت کرنے کا بندوبست کر دیں گے۔ بیٹا! تجھے دولت اور اس کی بدولت شہرت ملے گی۔"

آغا حشر کے ڈرامے یوں تو وزیروں کے مشغلوں کی طرح بے شمار ہیں لیکن مجھے ان کے ایک ڈرامے کا عنوان پسند آیا اور وہ ہے "صید ہوس"۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ایک ڈرامہ لکھا جائے، جس کا عنوان ہو: "شیر ہوس"۔ ظاہر ہے کہ ہماری قوم کو یہ خوں آشام درندہ بہت پسند ہے۔ وہ تو وہ اپنے محبوب لیڈروں کو "شیر بنگال" اور "شیر پنجاب" کے دل فگار خطابوں سے نوازتے۔ میں نے اس نام کو اس لئے ترجیح دی کہ یہ پسند خاطر احباب ہونے کے علاوہ عام فہم بھی تھا۔ خیر صاحب! میں نے ڈرامے کا پہلا منظر لکھا اور رات کے کھانے کے بعد مولانا یعقوب صاحب "شبچراغ" کی خدمت میں لیکر جس میں بادام، پستے، اور کشمش بھری ہوتی تھی

دو زانو بیٹھے تاکہ پوری پوری اصلاح ہو سکے۔ کہنے لگے،

"بیٹا! پہلے بسم اللہ پڑھو، اور اس کے بعد ڈرامہ سناؤ!"

"بسم اللہ تو ڈرامہ شروع کرنے سے پہلے ہی نہیں پڑھی تھی" میں نے عرض کیا۔

"بغدادی قاعدہ شروع کرنے سے پہلے تو پڑھی ہو گی" مولانا نے فرمایا۔ "جی ہاں"! میں نے عرض کیا تو خوش ہو کر فرمایا "ماشاء اللہ! پھر کوئی مضائقہ نہیں! ڈرامہ سناؤ!"

پہلا سین

سہیلیاں کوئی اچھا سا گانا گا کر گزر جاتی ہیں۔

طہماسپ بھیس بدل کر آتا ہے جسے کوئی پہچان نہیں سکتا۔

طہماسپ: (پیر مار کر) اسلم تو کس حال میں ہے۔؟

اسلم: (چیخ کر) شیر لکڑیوں کی ٹال میں ہے۔!

اس پر یعقوب صاحب نے بہت زور سے "ہوں" کی! میں ٹھہر گیا۔

"بیٹا! یہ کیسے ممکن ہے!" مولانا نے فرمایا "شیر تو جنگل میں ہوتا ہے۔ لکڑیوں کی ٹال میں کیسے آیا؟"

"ممکن کیسے نہیں" میں نے عرض کیا "مردم خور شیر بستیوں

میں آہی جاتے ہیں۔"

"لیکن لکڑیوں کی ٹال میں کیسے ممکن ہے" مولانا نے جھنجھلا کر کہا۔ "آخر وہاں بھی تو کافی آدمی ہوں گے!"

"ہو سکتا ہے رات کا وقت ہو اور سب سو رہے ہوں!" میں نے عرض کیا۔ "اور اتنے میں شیر آپہونچا ہو!"

یہ سن کر مولانا ہنسنے لگے اور فرمایا۔ "یہ عقل سے بعید ہے"

"آپ اس پر بھی غور فرمائیں۔ میں نے عرض کیا، "شیر میں خود کب عقل ہوتی ہے۔ وہ ٹھیرا ایک جانور!"

مولانا اب بھی ہنس رہے تھے۔ میں نے جز بز ہو کر عرض کیا۔

"مولانا، یہ شیر کب میرے تابع فرمان ہے کہ میں اسے آپ کے ارشاد کے مطابق ٹال کے بجائے کہیں اور لے جاؤں!"

مولانا نے چند منٹ سکوت کے بعد فرمایا: "میاں! ڈرامے میں کردار ڈرامہ نویس کی مرضی پر چلتے ہیں البتہ ناول میں ناول نگار کرداروں کی مرضی پر چلتا ہے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ تم ڈرامہ نویسی چھوڑو اور ناول نگاری شروع کردو۔ یہ کام آسان ہے۔"

اس دوران میں مجھے عصمت چغتائی کا ناول "ٹیڑھی لکیر" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اصل میں یہی وہ ناول تھا جو میں لکھنا چاہتا تھا۔ بالکل یہی چیز میرے دماغ میں چکر لگا رہی تھی اور میں حیران تھا کہ عصمت چغتائی جیسی لکھنے والی کو میرے دماغ کی اچھوتی پیداوار کیسے مل گئی۔ پھر بھی میں نے اس ناول کے عنوان کو مٹا کر "سیدھی لکیر" کی داغ بیل ڈالنی چاہی، لیکن توبہ کیجئے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج

میری دیدر ٹاور کا تو ذکر ہی کیا، ایسی ٹیڑھی اینٹ کی دیوار تو ثریا تک ٹیڑھی چلی جاتی ہے۔ میں تمام رات جاگتا رہا۔ قریب صبح میرا سر بھاری ہونے لگا۔ ایک لالٹین جو میرے سامنے جل رہی تھی، کچھ پھیلی — اور اسکے بعد اس کے دو ٹکڑے ہوگئے میں قدرے حیرانی سے دو لالٹینیں جلتی دیکھتا رہا۔ پھر یہ منظر آہستہ آہستہ تاریکی میں غائب ہوگیا۔ ٹیڑھی لکیر کتاب کی جلد پر سے اتر کر میری قمیص میں داخل ہوگئی۔

مجھے سینے پر کوئی شئے سرسراتی ہوئی معلوم ہوئی۔ میں گھبرا کر اٹھا اور کپڑے جھٹکتا ہوا بھاگا۔ لکیر سانپ کی طرح

میری گردن میں لپٹ گئی اور اپنے پھندے کو کسنے لگی ۔ میں دیوانہ وار ایک دکان میں گھس گیا ۔ ایک الماری سے ٹکرایا ۔ سینکڑوں کتابیں نیچے آپڑیں اور میں ان کتابوں پر گر پڑا ۔ پھر میری گردن سے سرسراتی ہوئی اتری اور ایک کتاب کی جلد پر ثبت ہو گئی ۔ میں نے ہمت کر کے پوری آنکھیں کھولیں اور کتابوں کی طرف دیکھا ۔ یہ سب کے سب انگریزی ناول تھے ۔ آنکھ کھلی تو غیب کے اس اشارے کو کافی سمجھا اور ایک ہفتے میں میری پہلی ناول تیار ہو گئی جو میں نے ایک ناشر کے ہاتھ ایک ہزار روپے میں فروخت کی ۔ اس میں میرا خرچ بہت کم تھا ۔ تفصیل یہ ہے ۔

ایک رجسٹر	۲ روپے
سادہ کاغذ	۳ روپے
مترجموں کی اجرت	۸۰ روپے
منشی ردو بدل کیلئے	۲۰ روپے
یعنی کل	۱۰۵ روپے

اس کے بعد میرے ناولوں کا تانتا بندھ گیا ۔ اگر اس وقت مولانا یعقوب ہوتے تو ان کی مسرت بے پایاں ہوتی ۔ وہ

بے چارے بی اے کی فرضی ڈگری کے سلسلے میں حوالات میں بند ہیں ۔ بہر حال میرے پاس دولت بھی ہے اور شہرت بھی ۔ میرے اکثر ناولوں کا ترجمہ انگریزی میں ہو گیا ہے ۔ اور میرے وہ قدرداں جنہوں نے میری ناولوں کے انگریزی ترجمے پڑھے ہیں ، اب ان کو اردو میں ترجمہ کر رہے ہیں ۔ میں اسلئے کامیاب ہوں کہ جو کچھ میری قوم چاہتی ہے ، میں وہی پیش کرتا ہوں ۔

ایسے صنعت کار بہت ہیں جن کے حوصلے وسیع اور کام کے طریقے روز بروز ترقی یافتہ ہوتے جا رہے ہیں ۔ یہ سیکڑوں کتابیں ادب کی چنگی سے بند کی بند پاس کرا رہے ہیں ۔ مغتیانِ ادب منفعت اندیشی کے مزے لے رہے ہیں ۔

بندوق اور سیاست کا لائسنس آدمی کو عمل پر مجبور کر دیتا ہے ۔ ہماری قوم نو آموز سہی ۔ لیکن اس نئی لذت سے مسحور ہو کر کارتوسوں کی پوری پیٹی خالی کرنے پر تلی بیٹھی ہے ۔ اس نازک وقت میں اسے "جی حضور" کے سوا اور کچھ سننا منظور نہیں پہلے ادیب و شاعر ایک فن کار تھا ۔ پھر استاد بنا ، اور اب صرف قوم کے جی حضوریے بننے پر اکتفا کر رہا ہے ۔ اس کا ادب کیا ہے ، اور اسے تاریخ کس نام سے یاد کرے گی ، اس کا فیصلہ تو

آئندہ زمانے پر چھوڑیئے۔ آیئے! آپ ہم مل کر نعرہ لگائیں۔
چالو ادب زندہ باد! جی حضور یئے زندہ باد! فرزابان وطن زندہ باد۔!!

پیرِ ہندی کے نام ایک خط

پیرِ ہندی!

آپ نے ہمیشہ ستاروں، آسمانوں اور فرشتوں کی باتیں کیں۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے حادثے میں جب پاکستان کے "ٹاپو" دھم سے برآمد ہوئے تو یقین کرنا پڑا کہ آپ کے اشعار میں نشوونما کی وہ پوری "آمد"

موجود تھی جس نے آپ کی قوم کو پال کے آموں کی طرح قبل از وقت پختہ کر دیا۔ پستیوں سے بلند ہونیوالی یہ قوم مقام جبرئیل سے آگے گذری ہے یا نہیں — یہ تو دل کی آنکھ سے دیکھ کر ہی بتایا جا سکتا ہے۔ ظاہری آنکھیں تو یہ دیکھتی ہیں کہ ابھی اس نے نصف منزل طے کی ہے۔ زندگی کے ثریا پر بیٹھ کر دوربین سے دیکھنے والے کہتے ہیں۔

"یہ قومی سیارہ ابھی تو خلاء میں مختلف محوروں کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ دل ترستا ہے اور ہاتھ نہیں پہنچتا۔"

پیر مہندی!

آئیے! میں آپ کو اس دنیا میں لے چلوں جہاں کے انسانوں کے سروں کو آپ کے حجازی تغنوں نے "حجازی" سائز کا تو بنا دیا ہے لیکن باقی مشینری میں تبدیلی نہ ہو سکی۔

یہ مرید پاکستانی جب ساحل کراچی پہ پہنچا تو دل شوق کی پھلجھڑی بنا ہوا تھا۔ ریت کے تودے موتی اور مونگے کے محل، بیچ لگزری ہوٹل اور پیلیس ہوٹل کے درمیان سمندر کا ٹھیرا ہوا اور سڑتا ہوا پانی، بکاؤلی کا مشہور تالاب معلوم ہوتا تھا۔ میری دیدۂ شاور انگشت شہادت اور میونسپل کارپوریشن آغوش مسرت نظر آتی تھی۔ خوش خیالی و شادمانی کے ان پھلجھڑی جذبات میں ہر رکھنا گدھا قومی کارکن اور ہر چلتا ہوا

اونٹ رہ نما دکھائی دیتا تھا۔ بہر حال جب یہ مرید پاکستانی دل میں گھر کرنے کی بجائے۔ لالو کھیت میں گھر لینے کی غرض سے روانہ ہوا تو آپ کا یہ شکوہ،

ع اپنے لئے لامکاں، میرے لئے چار سو

اگلے وقتوں کی بات معلوم ہوئی۔ یہاں تو سارے بندے لامکاں تھے کسی نے ایک دفتر کا پتہ بتایا۔ افسر نے سر سے پاؤں تک جائزہ لیکر فرمایا۔

نہیں ساحل تری قسمت میں اے موج
اُچھل کر جس طرف چاہے نکل جا

کہاں نکل جائیں؟ آگے سمندر ہے، پیچھے سرحد ہے۔ زمیں سخت آسماں دور ہے۔ ایک بڑے میاں جو متروکات کی انسائیکلوپیڈیا نے کھڑے تھے، ضبط نہ کر سکے۔ افسر پر ایک تیز "نگاہِ مرد مومن" ڈال کر تقریر شروع کر دی، افسر نے فوراً دو چپراسیوں کو اشارہ کیا۔ بڑے میاں تقدیر بدلنے کی بجائے لہجہ بدلنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ مرید پاکستانی تعلیم و تربیت کے تراشے ہوئے راستوں کی خستگی اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

آخرکار! وہ ذلت نفس جو بڑی بڑی جائدادیں حاصل کرنے کے لئے شہنشاہوں کے درباروں میں اٹھائی جاتی تھی — اور وہ واسطے جو انتہائی صبر شکن

وقت پر دینے کے لئے محفوظ رکھے جاتے تھے - استعمال کئے۔ تب کہیں ایک "پروانہ خانہ داری" ملا - شہر سے میلوں دور کسی قدر سایہ دار مکان ملا - بدلیاں چھائیں، بادل گرجے اور دھواں دھار بارش ہونے لگی - چھت کی کڑیوں میں ابابیلوں کی طرح لٹک کر زندگی بسر کرنی شروع کی اور آپ کا یہ مصرعہ گنگناتے رہے ۔

ع مکاں کیا شئے ہے، اندازِ بیاں ہے

ادھر یہ مرید پاکستانی چھت کی کڑیوں سے رِستی ہوئی پانی کی جھالر میں زنگ کھا رہا تھا اور وہیں ایک اللہ مرد خود آشنا اپنی خودی کو صیقل دے رہا تھا - صبح آنکھ کھلی تو دیکھا چھت کے نیچے جتنی زمین تھی، اس پر قبضہ ہو چکا ہے - ایک ہمدرد دوست خیریت دریافت فرمانے کے لئے تشریف لائے اور عاجز کو اس حال میں دیکھا تو برجستہ فرمایا -

تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

لہٰذا انگھا پیر کی چوٹی پر قیام اختیار کیا - یہاں آزادیٔ پرواز تو بہت تھی لیکن "دانہ دُنکا" عنقا تھا مجبوراً وادیوں میں اتر آیا - اس آثار میں عروس البلاد کراچی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی - اللہ کے نام سے موسوم ہوٹل، زندگی کی تمام جولانیوں سے پڑے دہک رہے تھے

راہ زن بازوؤں پر تعویذ باندھے، منہ پر نقاب ڈالے رات کی تاریکی میں شکار ڈھونڈتے پھر رہے تھے - رات کے چھاپے کا پچاس فیصدی دن کے اجالے میں "تحفہ تحائف" بن کر صاحبانِ اثر کے پاس پہنچ جاتا - دوسری رات کو تاریکی اور گہری ہو جاتی - ۲۵ فیصدی قابلِ ستائش کاموں میں لگایا جاتا جس سے چہرے کی نقاب دوہری ہو جاتی - ہر برخود غلط صداقت کا عَلم اٹھائے تیز قدموں سے چلتا نظر آیا تاکہ سب اپنے اپنے ٹھکانے لگ جائیں - اللہ اکبر! ہر شخص دستور ساز، ہر شخص نظامِ شہر کا ذمہ دار اور ہر شخص روحانی پیشوا ہے !

پیرِ ہندی —!

جمہور کے ہر فرد میں اس غضب کی شانِ پدری نہ کبھی دیکھی تھی! مجھے اس آثار میں یہ تین آنکھوں والے انسان نہایت تیزی سے زقندیں مارتے نظر آئے - ان کی ایک آنکھ بند رہتی ہے تو کیا ہے ان کی تیسری آنکھ جو بصیرت کی آنکھ ہے وہ تو کھلی ہوئی ہے -

ان تین آنکھ والوں نے اس عاجز کو اپنی ایک محفل میں اپنی برتری کا قانون قایم رکھنے کے لئے مدعو کیا - پورا کمرہ کسی بہت بڑے وزیر کی نماز جنازہ کا نمائش بنا ہوا تھا - "خواتین" کے لباس کی روشن ضمیری اور "حضرات" کے لباس کی بدن آفرینی سے گرد و پیش فضا میں تحلیل ہو رہا تھا - اتنے میں ایک قدآور

صاحب کھڑے ہوئے اور اپنی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سب لوگوں کی طرف دیکھ کر مسکرائے جن سے وہ بالکل ناواقف تھے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک صاحبہ سے گانے کی فرمائش کی۔ وہ صاحبہ بطور احتجاج آگے بڑھیں اور ایک دلنواز مسکراہٹ سے فرمانے لگیں:۔

"میں گاتی نہیں ہوں۔ میں تو اقبال کی شاعری گاتی ہوں!"

اس شعر پر پوری محفل نے تڑپ کر داد دی۔ لوگوں کے اس اشتیاق کو دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئیں اور انھوں نے کچھ اس انداز سے ہاتھ پیر چلائے کہ ہم سب کو اپنے اپنے دل صدف اور وہ گیت جو اس ماہ پارہ کے لبوں پر مچل رہا تھا، قطرۂ نیساں معلوم ہونے لگا۔ فرمانے لگیں:۔

"آ تجھ کو بتاؤں میں..... تقدیر امم کیا ہے؟"

جس وقت یہ مصرعہ پڑھا تو ذرا مسکرا کر باری باری حاضرین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پاس بلانے کا اشارہ کیا۔ پھر ذرا فخریہ انداز سے رک کر ہر ایک کو ضبط میں نمبر دینے لگیں۔ "تقدیر امم" کہتے ہوئے انہوں نے ایسے اشارے کئے گویا وہ قوموں کی تقدیر کی بجائے ماؤں کی تقدیر کے متعلق بتا رہی ہیں۔ اب کے وہ پھولوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح جھومیں اور حاضرین کا نشانہ باندھ کر دوسرا مصرعہ گایا۔

شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

شمشیر و سناں کہتے ہوئے انہوں نے کلمے کی انگلی سے آنکھوں کی طرف اشارہ کیا یعنی سنان نگہہ اور تیغ ابرو سے پہلے کام لو۔ طاؤس و رباب کا کھیل تو بعد میں ہوتا ہی ہے۔

پیر ہندی۔!

آرٹ کی اس ترکیب استعمال سے یہ عاجز لرزہ براندام ہو گیا گانے کے بعد کھانا شروع ہوا تو طبیعت میں کچھ سکون پیدا ہوا لیکن آپ کا ذکر خیر چھڑ چکا تھا۔

"حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے کلام کو سمجھنا بہت دشوار ہے۔" ایک بااختیار افسر نے کہا۔

"اور سمجھ کر عمل کرنا دشوار تر ہے" میں نے عرض کیا۔

"میں نے اقبال کے ایک شعر سے بہت اثر لیا ہے" جیلوں کے ایک افسر نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"اور میں نے ہزاروں آدمیوں کی زندگی بدل دی!" سب کی نگاہیں جیلوں کے افسر پر مرکوز ہو گئیں۔

"میں نے قیدیوں کی ایسی اخلاقی تربیت کی ہے کہ اب ان سے کوئی غلطی ہوتی ہے تو وہ فوراً سزا طلب کرنے کے لئے خود آ جاتے ہیں۔

اور یہ کمال اقبال کے اس شعر کا ہے جو میں نے تختیوں پر لکھوا کر جا بجا ٹنگوا دیا ہے۔

"خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری سزا کیا ہے"

"قبلہ یہ شعر تو درست نہیں ہے۔" وکیل صاحب نے بے اختیارانہ ہنستے ہوئے کہا "رضا کو سزا سے بدل دیا گیا ہے!"

"جناب! میں نے تو اسی طرح پڑھا ہے۔ اوروں کو اسی طرح پڑھتے سنا ہے اور اسی طرح درست بھی معلوم ہو سکتا ہے" جیلوں کے افسر نے جوش سے کہا۔

"واہ جناب واہ" وکیل صاحب نے زہر خند سے کہا "آپ افسران نے ہم لوگوں پر اپنے اختیارات کی آزمائش کرتے کرتے اب اقبال پر بھی مشق شروع کر دی!"

ایک پروفیسر صاحب اپنی عینک سے بار بار ہمیں گھور رہے تھے اور ہماری گفتگو میں اپنا پیچ لڑانے کے لئے بے تاب تھے۔

"ارے صاحب افسروں کی بات چھوڑیئے" وہ مسکرا کر کہنے لگے۔ "یہ تو حافظ و سعدی کے زمانے میں بھی ایسے ہی تھے۔ میں آجکل ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔"

ہر شخص پروفیسر صاحب کی طرف متوجہ تھا۔

"دیکھئے!" پروفیسر صاحب نے انگلیوں سے میز بجا کر کہا "قوموں کی سربلندی کا راز تحقیق میں ہے۔"

"کتاب کا موضوع کیا ہے؟" آواز آئی۔

"موضوع؟" سپاٹ چہرے کے پس منظر میں اگلے دو دانت جگنوؤں کی طرح چمکنے لگے۔ "عجیب ہے یعنی اردو ادب میں جانوروں کا طرز عمل"

قہقہوں سے برافروختہ ہو کر فرمایا "صاحب! اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ میں نے اردو کے تمام نمائندہ شاعروں کے کلام سے ہاتھی، گھوڑے، کتے، گدھے، سانپ، بلبل، کوئل، قمری وغیرہ سے متعلق مطالعے جمع کئے ہیں۔ پرندوں درندوں کے اس جم غفیر میں اقبال نے شاہین، کرگس، ممولے اور دیمک وغیرہ کا اضافہ کیا ہے۔"

"پھر آپ اس کتاب کا عنوان بدل کر ادبی چڑیا گھر رکھ لیجئے" وکیل صاحب نے آنکھیں چمکا کر کہا۔

میں سوچنے لگا کہ ایک کتاب "اردو ادب سے جانوروں کا طرز عمل" بھی لکھی جائے تو پوری مہم سر ہو جائے۔

پیرِ ہندی!

بہر حال آپ کے نغمات نے اس متفکر قوم کو متفکر بنا یا۔ لیکن شاید یہ ایک صبح کاذب تھی۔ ایک نکھار نگ تھا جو آرزوؤں کے آفتاب کے چمکتے ہی ماند پڑ گیا۔ آپ نے کہا تھا۔

قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

افرنگ کے ہاں تو علم و فن دیوالی بنکر جگمگا رہے ہیں لیکن یہاں ابھی تک اندھیرا پڑا ہے۔ آپ کی قوم کے وہ افراد بھی جو آج آپ کے اقوال سے اچھا نفع کما رہے ہیں، آپ کے جیتے جی آپ سے بے اعتنائی برتتے رہے انہیں ڈر تھا کہ کہیں آپ ان سے اپنی عظمت کی پگڑی نہ مانگ بیٹھیں ان کے نزدیک علم و فن کی قدر بس اسی حد تک ہے کہ وہ افرنگ کی بھیجی ہوئی ماچسوں کے بند شعلوں سے یہاں اہل علم کے چراغ مزار روشن کریں۔ وہ لوگ جو اپنے "شاندار ماضی" کے مزار پر سجدہ ریز تھے اور جنہیں آپ اٹھا کر کارزار حیات میں لائے تھے انھوں نے اب آپ کا مزار بنا لیا ہے اور اس کے آگے سجدہ ریز ہیں۔

ٹانگ اڑانے کا فن

اگر وہ دور آجائے کہ ٹڈیوں کی جنس تبدیل ہونے لگے، گھوڑے لانگ بوٹ پہننے لگیں، کرم کلے قندھاری سیب کی طرح سرخ ہو جائیں برگد کے درخت میں رس گلے پیدا ہونے لگیں۔ ستار پر میاں کی ٹوڈی سننے سے بہریوں کے پیٹ بھر جائیں، اسکولوں میں بچوں کو ایک ایک گلاس پانی کے ساتھ کتابوں کے بُرادے کی گولیاں تقسیم ہونے لگیں تو مجھے اتنی حیرت نہ ہوگی لیکن جب ان لوگوں کو دیکھتا ہوں جو باتوں

وہ :- "قبلہ میں تو یونان اور یونانی ادب سے متاثر ہوں۔"؟

میں :- (چونک کر) "خوب!"

وہ :- (فاتحانہ انداز میں) "آپ نے سیفو کا کلام پڑھا ہے۔؟"

میں :- "جی ہاں! سیفو کے نام سے منسوب کلام پڑھا ہے!"

وہ :- "اچھا! (حیرت سے) تو قبلہ آپ سیفو سے واقف ہیں؟"

میں :- "وہ مجھ سے بہت پہلے گزری ہے۔ اس دور میں ہوتی جب بھی ملاقات مشکل تھی!"

وہ :- (مسکرا کر) "ہاتھ ملایئے قبلہ! آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی!"

میں :- "لیکن جناب! میں یونان سے اس لئے متاثر نہیں ہوں کہ وہاں سیفو پیدا ہوئی۔ اس سرزمین سے علم و ادب کے ایسے سورج طلوع ہوئے جن کی نظیر انسانی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ یونان کے ساتھ صرف سیفو کا نام لینا، ایسی بات ہے جیسے یہ کہنا کہ میرٹھ میں ہندوستان کا مشہور کبابی سیتا پیدا ہوا تھا گویا میرٹھ کو صرف یہی فخر حاصل ہے۔"

وہ :- "یہ تو درست ہے قبلہ (گھبرا کر) سیفو عورت تھی اور مسلمان۔۔۔۔"

میں :- "جی ہاں سیف الدین کی بہن تھی، اس لئے بھی واجب التعظیم ہے!"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میں نے اخبار پڑھنا شروع کر دیا کچھ دیر

وہ مجھے گھورتے رہے پھر اٹھ کر چلے گئے۔ اس حملے سے جو ناتوانی پیدا ہوئی وہ ابھی باقی تھی کہ دوسرا سانحہ پیش آیا۔

ایک دن ایک اور چلتے پھرتے انسائیکلو پیڈیا سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

وہ :- "آپ نے تو جدید انگریزی شعراء کو پڑھا ہوگا۔ یعنی کہ مجھے یہ جاننے کا اشتیاق ہے کہ قدیم شعراء میں سے ___ یعنی کہ شیکسپیئر کی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے!"

میں :- "لازوال! بے مثال"

وہ :- "ہمارے ہاں کوئی ایسا شاعر؟"

میں :- "کیوں نہیں ___ غالب!"

وہ :- "دورِ قدیم میں یعنی کہ شیکسپیئر کے بعد کوئی ایسا شاعر جسے اس کا ہم پلہ سمجھا جائے؟"

میں :- "میں ادب کا طالب علم ہوں۔ کوئی پیشہ ور پروفیسر نہیں ہوں، اور نہ منبر پر کھڑا ہوا مجمع پر رعب ڈال رہا ہوں جو آپ سوال پر سوال کئے جا رہے ہیں۔"

وہ :- (مسکرا کر) "یہ سوال مجھ سے کیا گیا ہے اور میں آپ سے یعنی کہ جواب چاہتا ہوں۔"

میں :- "جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے۔ براؤننگ ایک ایسا شاعر ہے جو شیکسپیئر کا ہم پلہ کہا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کے کلام میں کسی قدر آورد ہے اس لئے اسے وہ عظمت حاصل نہ ہو سکی۔

وہ :- "براؤننگ (صحیح کی) براؤننگ! یعنی کہ یہ اپنے علامہ اقبال کے استاد!"

مجھے اپنے آپ پر بہت طیش آیا اور میں گردن جھکا کر خاموش ہو گیا۔ یہ حملہ آور بھی کچھ کم ذہین نہ تھا چند منٹ خاموش رہا پھر آہستہ سے بیگ کھولا۔ اور اس میں سے ایک کتاب نکال کر میرے سامنے رکھ دی

وہ :- "یہ بائیبل ہے"

میں :- "اچھا!"

یہ کہہ کر میں نے بے دلی سے کتاب کی ورق گردانی شروع کر دی

وہ :- "میں آجکل یعنی کہ بائیبل پڑھ رہا ہوں!"

میں :- "خوب!"

وہ :- "آپ نے بھی پڑھی ہو گی؟"

میں :- "جی ہاں!"

وہ :- "کیا فصاحت و بلاغت ہے یعنی کہ ہر ہر جملہ اثر کرتا ہے!"

میری سادہ لوحی دیکھئے! کتاب دیکھتے ہی بھول گیا کہ کس سے

مخاطب ہوں۔

میں :- "جی ہاں! انگلستان کے مشہور مقررین نے ہمیشہ بائبل سے تحریک حاصل کی اور اپنی تقریروں میں بائبل ہی سے حسن بیان مستعار لیا۔ انگریزی میں بائبل سے زیادہ فصیح و بلیغ کتاب نہیں!"

وہ :- (طمانیت سے) درست ہے! آپ نے حضرت عیسیٰ کی نظمیں پڑھی ہیں؟"

میں :- "حضرت عیسیٰ کی نظمیں! کیا مطلب؟"

وہ :- "وہی سونگ آف سانگس جسے نغمۂ سلیمان بھی کہتے ہیں!"

میں :- "حضرت عیسےٰ پیغمبر تھے۔ شاعر نہیں تھے نغمہ نغمات یا نغمۂ سلیمان' اس دور کے صوفی شاعروں کا کلام ہے جن کا اضافہ بائبل میں کر دیا گیا۔"

وہ :- "بہر حال میں یعنی کہ حضرت عیسیٰ کا قائل ہو گیا۔"

اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں یونہی بیٹھا ہوا خون کے گھونٹ پیتا رہوں۔

میں :- "آپ حضرت عیسیٰ کے سچے پرستار ہیں۔ آپ نے ان کو جس قدر سمجھا ہے، اتنا کم لوگ سمجھتے ہیں۔ مجھے بہت مسرت ہوئی اب دیکھیں آپ کے متعلق ان کی رائے کیا ہے۔ میں بائبل کو کسی ایک

جگہ سے کھولوں گا۔ جو صفحہ کھلے گا، اس کی سولہ سطریں چھوڑ کر پڑھنا شروع کروں گا۔ اس میں جو کچھ لکھا ہوگا وہی حضرت عیسیٰ کا پیغام ہوگا۔"

وہ یہ سنکر چکر میں آگئے اور زیر لب مسکرا کر کن انکھیوں سے دیکھنے لگے میں نے آنکھیں بند کر کے بائبل کا ایک صفحہ کھولا پھر سولہ سطریں گن کر چھوڑیں اور پڑھنا شروع کیا۔

"اے یسوع دیکھ اس گاؤں کی طرف جہاں ایک گدھے کا بچہ بندھا ہوا ہے جب تک تو اس پر سواری نہیں کریگا، اسکی نجات نہیں ہو سکتی!"

میں نے جب پوری عبارت پڑھکر سر اٹھایا تو ان کی کرسی خالی تھی۔

آجکل کچھ وہی سماں ہے جو گروپ تصویر اترتے وقت دکھائی دیتا ہے کوئی تصویر میں نمایاں ہونے کیلئے کسی کا کھوا دبا رہا ہے کوئی تصویر کے فریم میں جگہ پانے کیلئے کسی کے شانے کو اپنی ٹھوڑی سے زخمی کر رہا ہے کوئی کم قد اکسی لم قدے کی بغل سے اس طرح سر نکالے ہوئے ہے کہ لم قدا بغل میں تربوز دبائے دکھائی دیتا ہے، اور جو ہر جگہ بے بس ہے وہ سب سے پیچھے ایک اسٹول پر کھڑا ہوا علامت استفہامیہ بنا ہوا ہے۔ سب وقت لیجانے کی اسی بیماری کے باعث ایک ہلدی کی گرہ سے پنساری بن جانے والوں نے فٹ پاتھ پر دکانیں لگائی ہیں یہ دکانیں اسی وقت ہٹیں گی جب کہ علم و ادب کی مملکت میں مارشل لاء نافذ ہوگا۔

اے میری ڈائری

اے جانِ وفا۔! تیری جدائی نے زندگی کو خداداد کالونی کی طرح امید و بیم کی بازیگاہ بنا دیا تھا۔ ہر رات چاند تیری تصویر دکھاتا، ہر تارہ ملاقات کا پیغام سناتا لیکن صبح کا نقیب مسکراتا اور کہتا۔

"اے پاکستانی شہری تو تو اپنے بھائیوں کی طرح سادہ دل ہے۔ تو نے رات بھر جو خواب دیکھا تھا وہ غلط ہے"

ہاں! تو میری ڈائری میں تیرے لئے شب و روز مرتا جیتا رہا ہوں۔

آج ہم سالہا سال کے دورۂ فراق کے بعد یکجا ہوئے ہیں لیکن یہ کیا۔؟ وہ تیری چمپئی جلد کہاں گئی؟ ہائے! ترا رنگ روپ بگڑ گیا! بارش کے چھپکوں، سیلی ہوئی ہوا کے تھپیڑوں اور گرد کے بگولوں نے تیری من موہنی صورت پر بھوری بھوری چھائیاں ڈال دی ہیں۔ آہ! تیرے جگر جگر سنہری کنارے چاکلیٹی ہو گئے ہیں۔

ڈائری:۔ (آہ سرد بھر کر) میرے ہمدم میرے دوست۔! یہ انقلاب ہے۔ ہر شے رنگ کھڑا کر بدل رہی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انقلاب میں تبدیلیاں ہوتی ہیں لیکن یہ کبھی نہیں سنا کہ تبدیل ہونے والی شئے دوسروں کو بھی منقلب کرتی ہے۔

ڈائری: یہ بھی کسی قدر ممکن ہے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔

اے جانِ وفا! تمہارا خیال غلط ہے۔ یہ تو تم ان معصوم خربوزوں کا ذکر کر رہی ہو جو اگلے زمانے میں فالیز پر جنم لیتے تھے۔ آج کے خربوزے تو تربوز کو بھی دیکھ کر رنگ بدل لیتے ہیں۔ پھر آس پاس کے تمام باغ بغیچے، پھل اور پھول پتے من تو شدم تو من شدی کے مقام اعلےٰ پر پہنچ جاتے ہیں۔

ڈائری: (حیرت سے) میں سمجھی نہیں!

میری ڈائری! تمہاری اور ہماری ملاقات ایک جلسے میں ہوئی تھی اس وقت تمہارا رنگ زرد اور حکومت کا سفید تھا۔ اور اب جب ہم تم ملے ہیں تو تمہارا رنگ بادامی اور حکومت کا کالا ہے۔ خدا اور اس کے کارندوں کو یہی منظور تھا کہ ہمارے ذوق رنگ پرستی میں تبدیلی ہو۔ ایک صبح کو سفید مرغابی نے ہوا میں غوطہ کھایا اور ابھری تو دیوار پہ کوا بیٹھا تھا۔

ڈائری: ہائیں! کیا مطلب۔؟

بس یہی کہ ہم نے سفید تاج اتار پھینکا، اور کالا تاج پہن لیا شادیانوں کی گونج سے عوام کے دل دھڑکنے لگے اور وہ تاجی کو تن تنہا چھوڑ کر "فوق الانسانوں" کی تلاش میں اس طرح نکل گئے جیسے ماہی باز گرم و سرد موسم سے بے پروا مچھلی کے کانٹے لیکر منہ اندھیرے کوچ کر جاتے ہیں۔ اس عرصے میں یہ کالا تاج پھلنا، پھولنا۔ اور پھیلنا شروع ہوا۔ اتنا پھیلا، اتنا پھولا کہ بادشاہ سلامت پر ٹی کوزی کی طرح ڈھک گیا۔

اب حکومت کا چلانے والا کہیں نہ سوجھتا تھا۔ بس حکومت چلتی ہوئی نظر آئی تھی۔ تخت طاؤس پر کالا تاج ہی کالا تاج تھا۔

ایکدن صبح سویرے اس کالے تاج کی کلغی سے سیاہ رنگ کا ایک دھارا ابلا اور محلات، کوٹھیوں، شاہراہوں اور گلیوں میں دوڑنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے امیروں کے دل کالے ہو گئے بزم نشاط و عیش

کی راتیں کالی ہونے لگیں۔ کلموہیوں کا کاروبار چمکنے لگا۔ ہر طرف دال
میں کالا کالا نظر آنے لگا۔ دشمنوں کی کالی زبانوں کا بول بالا ہونے لگا
شریفوں کی آستینوں میں کالے پلنے لگے۔ ادب اور آرٹ مرے ہوئے
گوروں کے سوٹ اتار کر دیبا و حریر کے انگرکھے پہنتے پہنتے کالی چادروں
میں لپٹ گئے۔ بے گھری مہ جبینوں کے چہروں پر کلونس آگئی۔ پری
پیکراں اور کلو پری بن گئی۔ غاصبوں کے کل دمے آسمان پر اڑنے لگے
اور ہر وعدہ کالی جمعرات پر ٹلنے لگا۔

ڈائری: ہائے ہائے! کلجگ ہے!

میری ڈائری! مشرق کا آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہے
اس سفیدی کا تھوڑا بہت پرتو یہاں بھی پڑتا ہے اس لئے ابھی یہ
نہیں کہہ سکتے۔

ڈائری: تو پھر یہ کہنا چاہیئے کہ بہت تاریخی دور ہے۔!

ہاں! یہ مانا جا سکتا ہے۔ خود "کالا" تاریخی افسانوں کی دنیا لئے ہوئے
ہے۔ دنیا کی سب سے مشہور ہیروئن لیلیٰ کالی تھی۔ مجنوں سے روحانی
ملاقات کا ذریعہ، کتا بھی کالا تھا۔ شاخِ نبات کے رُخِ روشن پر
کالے تل کے فل اسٹاپ نے حافظ شیرازی کو سمرقند اور بخارا جیسے
شہروں کی قربانی پہ مجبور کر دیا تھا۔ کالی آنکھوں کی ہر جگہ پرستش

ہوتی ہے اور کالا گلاب مشکل سے ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ انسان کالے سے
مانوس ہی نہیں بلکہ محبت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی انسان کے چہرے
کی سیاہی دھوتا ہے اور اسے سفیدی کے نور سے نوازتا ہے تو وہ اپنا منہ
کالا کر لیتا ہے۔ اگر کالا محبوب نہ ہوتا تو خضاب کا کالا کاروبار آج ایک
صنعت نہ بنتا۔

ڈائری: آپ کے اس کو نشار پر مجھے ایک واقعہ یاد
آگیا۔ ایکدن میں بیٹھی ہوئی اپنے صفحے الٹ رہی تھی۔
ایک جگہ لکھا تھا۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں۔!

ہائے غالب! بے اختیار دل چاہا کہ ایشیا کے
اس عظیم ترین شاعر کے مزار کی زیارت کروں۔ یہ آرزو
عرصے تک پوری نہ ہوئی۔ پھر اس دن جب آپ مجھے جلسے
میں ایک کرسی پر بھول گئے تھے تو میری آنکھوں میں
اندھیرا آگیا اور میں بیہوش ہوگئی۔ جب آنکھ کھلی تو چاروں
طرف ہو کا عالم تھا۔ میں گھنٹوں آنسو بہاتی اور یہ مصرعہ
گنگناتی رہی۔

ع یہ جانتی اگر تو لٹاتی نہ گھر کو میں

صبح کا گریباں چاک ہوا تو ایک پستہ قد آدمی سیٹی بجاتا
ہوا اور فوجی جوتوں سے فرش پر تال دیتا ہوا آیا۔ وہ خاکی
وردی پہنے ہوئے تھا اور اس کی تیز آنکھیں بالوں کی جھالر
سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ یکایک اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ
لپک کر آیا اور آناً فاناً میں، میں اس کے چوڑے چکلے
اور مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں تھی۔ ایک آہ کی آواز
آئی اور میں پھسل کر اس کے کوٹ کی جیب میں گر پڑی
تھوڑی دیر تو میں آپ کی جدائی میں افسردہ رہی پھر
جیب میں پڑے ہوئے بیڑی کے ٹکڑوں، ادھنوں،
اور چابیوں کے گچھوں سے کھیلنے لگی۔ ایک کونے میں
مجھے ایک زرد رنگ کا ٹکٹ نظر آیا۔ اس کے ایک
رخ پر ۱۳۰ پونڈ لکھا تھا۔ اور دوسرے رخ پر لکھا تھا
آج کا دن بہت اچھا ہے۔ تمہیں کوئی قیمتی شے ملے گی
اسے دیکھ کر میرا قہقہہ نکل گیا۔ یہ شخص ایک ٹیکسی ڈرائیور تھا
اور اس وقت بھی سواریوں کو لیکر کہیں جا رہا تھا۔
تھوڑی دیر بعد گاڑی رکی۔ دروازے کھلے اور بند

ہوئے۔ کسی نے زور سے کہا، یہی ہے جناب! اردو کے
عدیم المثال شاعر غالب کا مزار۔"

میں نے شدتِ اشتیاق میں ذرا سا جھانکا ایک
زور کا جھٹکا لگا۔ ڈرائیور کا بھاری بھرکم ہاتھ جیب
میں آیا۔ میں خوف سے تھرا کر ایک کونے میں دبک
گئی۔ بارے خدا نے فضل کیا۔ ڈرائیور کا ہاتھ ایک
تندرست بیڑی کو کشاں کشاں باہر لے گیا۔ اب میں
نے ذرا اگردن نکالی تو مزار سامنے تھا۔ دل بھر آیا
میں نے چلا کر کہا۔ "غالبؔ" جواب آیا۔

Yes madam, what can
I do for you,

(ہاں! محترمہ! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا
ہوں۔)

اے ہے! میں نے کہا، یہ تو انگریزی بولنے
لگا۔ کوئی اور روح تو نہیں آگئی یہاں۔؟ کیا تم
انگریز ہو۔؟ جواب آیا!

"No, I am sick of
Undu verse, I am trying
a little English prose
I have heard that
English does not know
geographical berniens."

(نہیں! میں اردو شاعری سے بیزار ہو گیا ہوں۔ اب میں ذرا انگریزی نثر کی مشق کر رہا ہوں میں نے سنا ہے کہ انگریزی جغرافیائی حد بندیوں میں پابند نہیں ہے۔)

میں نے اپنا سر پیٹ کر کہا۔ ہائے۔! میں تو سمجھی تھی کہ تم میرے صفحات پر کوئی تازہ شعر لکھ دوگے تو میں اپنے مالک کے لیے تحفتہً لے جاؤں گی۔ غالب نے آہ بھر کر کہا، شعر اور اس زمانے میں جبکہ

سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

میں نے کہا: غالب مگر یہ تو سوچو کہ یہ افعی رفتہ رفتہ دھوپ کھا کر سپیر عصا بن جائیں گے۔ آج تم ایک بڑی دولت سے مالا مال ہو۔ آج تم آزاد ہو۔ ایک

آزاد مملکت کے باشندے۔

غالب نے جھلا کر کہا۔ کون سا حرف آزاد ہوا ہے۔ پہلے گورے کی قید میں تھے، اب کالے کی قید میں ہیں۔ ادب تابدان پر رہ گیا، تہذیب آتشدان کی نذر ہو گئی۔ افراد خاندان میں تقسیم ہو گئی۔ معاملات ملکی میں پاندان کی چلنے لگی۔ لے دے کے ایک زبان رہ گئی تھی تو، وہ جغرافیے کی حد بندیوں میں شرم سے گاؤ زبان ہو گئی

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

میرا دل امڈ آیا۔ میں نے غالب پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی اور اپنا منہ ڈھک لیا۔

میری ڈائری! شیخ چلی پاکستانی ایک رات اپنی جھونپڑی میں سویا تو خواب میں اس نے اپنے آپ کو موتی محل میں پایا۔ ہم سب اس کی خوش خرابی پر خوب ہنسے اور ہمارا تمام ادب اس کے لطائف سے گدگدا گیا۔ ادھر بھارتی لال جاٹ کے سپنے میں کھاٹ آئی تو تمام بنیے پیٹ پکڑ پکڑ کر خوب ہنسے۔ تقسیم ہند کی تحریک پر، انگریز، امریکی جرمن، جاپانی، سب کے سب برسوں ہنستے رہے۔ یہ کسی نے نہ سوچا کہ شیخ چلی پاکستانی اور بھارتی لال جاٹ کے خواب سچے ہو سکتے تھے

بشرطیکہ میونسپلٹی والے حق و انصاف کو دیوانے کتوں کی گاڑی میں بند کر کے نہ لیجاتے۔ اب کراچی میں چینی کا سامان، حیدر آباد میں سلک کے تھان کشمیر میں قالین، ڈھاکے میں ململ، مراد آباد میں برتن، آگرے میں ہاتھی دانت کے تاج محل اور بنارس میں ساڑیاں نہیں بنتیں۔ ان تمام صنعتوں کی برآمد رک گئی ہے، صرف ایک چیز برآمد کی جاتی ہے اور وہ ہے عقل سلیم! اللہ اللہ کیا ترقی کا زمانہ آگیا ہے۔ رہے نام مشرق کا!

قوم کے خادم

پیارے قارئین۔!

یہ ڈرامہ تجارتی زاویۂ نگاہ سے جائداد غیر منقولہ، ادبی لحاظ سے جائداد منقولہ اور سیاسی نقطۂ نظر سے موروثی جاگیر ثابت ہوا ہے۔ یہ لافانی شاہکار سلور، گولڈن اینڈ ڈائمنڈ جوبلی کی حدود سے گذر کر ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما، کا اشتہار بن چکا ہے یہ ڈرامہ پہلی بار سیب کے درختوں

کے نیچے کھیلا گیا۔ اور اس میں آپ کے محبوب اداکار ماسٹر ہابیل نے ہیرو اور ماسٹر قابیل نے ولین کا کردار ادا کیا آج بھی یہ دنیا کے تمام بڑے شہروں میں "بیک وقت" دکھایا جا رہا ہے۔

پٹاخہ چھوٹے اور پردہ اٹھنے سے پہلے چند ہدایات ضروری ہیں۔ ممکن ہے آپ ان کرداروں کی گفتگو سن کر ان سب کو "بیک وقت ولین" سمجھ بیٹھیں، اور حضرت عیسیٰ کے ہمخیل ہو کر چیخنے لگیں "جن درختوں میں پھل نہ لگتے ہوں انہیں گرا دو اور ان سے آتشدان گرم کرو۔ نمک جو انسان کے لیے بہترین شے ہے اگر نمکیت سے عاری ہو تو اسے سڑک پر بچھا کر روند ڈالو!" پھر آپ مرزا ظاہر دار بیگ کو فنا کر کے انسانوں کو سیدھی راہ دکھانے کیلئے خود پیچ و تاب کھانے لگیں۔

اگر مغرب نے حضرت عیسیٰ کے فرمودات کو تسلیم کیا ہوتا تو یہ ڈرامہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا لیکن نطشے جیسے باثر فلسفیوں نے اس طرز فکر کو غلام گردی کی تحریک کہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب میں کتے اور گھوڑے کے سوا اور کسی

کی نسل کا وجود نہ رہا۔ اب گالٹن اور ہیولک ایلس عمدہ نسل سے پیدا ہونیوالے عمدہ آدمیوں کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں، اور بے سود!

اگر آپ اسپنگلر کے ہم خیال نہیں اور افراد و اقوام کو تہذیبوں کی بربادی کو ان کی شاندار تکمیل نہیں سمجھتے تو یقیناً آپ اوہام پرستی میں مبتلا ہوں گے ـــــ لیکن یہ کیوں۔؟ آپ کی پہلی حالت اور دوسری کیفیت ـــــ دونوں بے سبب ہیں۔ اگر آپ سب سے زیادہ قتل کرنے والے کو فخر قوم اور سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والے کو وکیل انصاف کہہ کر ایک کیلئے ایڈیٹوریل نوٹ اور دوسرے کیلئے کرنسی نوٹ تیار رکھتے ہیں تو پھر ان کرداروں نے ایسا کیا تصور کیا ہے جو آپ ان پر فتوؤں کے تیر چلائیں جب کوئی معاشرہ بگڑ جاتا ہے تو اچھے لوگ بھی برائی کے زنجیرے میں پھنس جاتے ہیں۔ اسی لئے آپ اور ہم جیسے معمولی آدمی بھی غلطیاں کرنے لگتے ہیں۔ جب معمولی آدمیوں کی گرفت نہیں تو ان بے چارے بڑوں سے باز پرس کیسی ـــ؟ ویسے یہ قوم کے خادم

ہیں ـــــ اور خادموں سے اکثر غلطیاں ہو جاتی ہیں۔

(پردہ اٹھتا ہے)

(ایک آراستہ کمرہ۔ مسٹر بدیشی ایک پلنگ پر لیٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تھوڑے سے فاصلے پر بیگم ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی سوئٹر بنتی دکھائی دیتی ہیں۔)

بدیشی :۔ (اپنے آپ سے) ایم۔ اے بدیشی۔ کتنا خوبصورت نام ہے اگر ریڈیو پاکستان کا کوئی اناؤنسر جلدی میں کہے تو ایم۔ اے جناح سنائی دے۔ مسٹر ایم اے بدیشی! (مسکرا کر) مسٹر محمد بدیشی۔! ـــ بدیشی!! ہا۔! کیا شاندار حرف ہے۔ ب۔ ب سے بادشاہ ب سے بہادر ب سے بڑا آدمی! آہاہاہا۔!

بیگم :۔ (تیزی سے) ب سے بدمعاش۔! ب سے بدتمیز! ب سے بکواسی۔!

بدیشی :۔ (چونک کر اٹھ بیٹھتا ہے) ایں!!! بیگم۔! میں سمجھا تھا کہ۔ کہ ـــ تم سو رہی ہو۔؟

بیگم :۔ (جھلا کر) یہ جملہ اپنی قوم کے بارے میں کہیئے۔ میری تو جس دن سے شادی ہوئی ہے آج تک برابر جاگ رہی ہوں۔ اگر اس

عرصے میں ذرا سا اونگھ بھی لیتی تو تم مجھے کہیں نہ کہیں ہار آتے

بدیشی :۔ (منمناتے ہوئے) ایسی باتیں نہ کرو بیگم!

بیگم :۔ میں تو تمہارے صدارت کے چکر سے تنگ آگئی ہوں۔ گھر میں ایک بھی پیسہ نہیں رہا۔ اب کل جو تم نے قاسم کو پانچ ہزار روپے دیئے یہ بالکل غلط تھا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان پانچ ہزار روپوں سے تم ایک ہزار ہمدرد پیدا کر لو گے۔

بدیشی :۔ انشاء اللہ انشاء اللہ

بیگم :۔ مجھے انشاء اللہ نہیں، چیک چاہیئے۔ تمہاری صدارت سے نہ توے پر روٹی سک سکتی ہے اور نہ اس سے سالن بگھر سکتا ہے۔

بدیشی :۔ مجھے اس وقت صرف ایک فکر ہے اور وہ یہ کہ اسٹاف اضافہ مانگتا ہے۔ اگر اضافہ نہیں کرتا تو ہڑتال کی ننگی شمشیر ہے،

بیگم :۔ اگر تمہارا اسٹاف ہڑتال کر دیتا ہے تو مجھے کیا۔؟ اگر وہ تین ہزار برس تک کام پر نہ آئیں تو میری بلا سے! میں یہ کہتی ہوں، یہ خرچ کون پورے کرے گا۔؟

بدیشی :۔ اللہ تعالے پر بھروسہ رکھو بیگم اب اپنے ستاروں کی چال بدلنے والی ہے۔!

بیگم:- میں اس چال میں نہیں آتی - میں اپنے اخراجات کے لئے اللہ تعالیٰ
پر بھروسہ رکھوں، اور تم اپنی صدارت کے لئے پانچ ہزار روپوں
پر اعتبار کرتے ہو۔

بدبیشی:- (ہنس کر) تم ضرورت سے زیادہ ذہین ہوتی جارہی ہو۔ یہ
بھی جانتی ہو، ہماری قوم کو ذہین آدمیوں کی ضرورت نہیں۔

(دروازے پر دستک بدبیشی صاحب تیزی سے کمبل اوڑھ کر
خراٹے لینے لگتے ہیں)

بیگم:- (زور سے) اندر آجائیے -!

(ایک اجنبی زرد رنگ کا سوٹ پہنے داخل ہوتا ہے)

اجنبی:- (احترام سے جھک کر) مسٹر بدبیشی کہاں ہیں ؟

بیگم:- وہ باہر گئے ہوئے تھے۔ تھک کر واپس آئے ہیں۔ صبح
سے باغ کی کھیتی کیاری، دوپہر سے مہاجرین کی آبادکاری
(رکتے ہوئے) اور سہ پہر سے شیخ عبدالباری سے مشورے
میں مصروف تھے۔

اجنبی:- (مسکرا کر) اب شام کو میری باری ہے۔ (بدبیشی
کی طرف غور سے دیکھتا ہے۔)

بیگم:- (گھبرا کر) میں انہیں اٹھا نہیں سکتی! وہ بے خبر

سو رہے ہیں، اور یہ کہہ کر سوئے ہیں کہ اگر وزیر اعظم کا ٹیلیفون
آئے تب بھی مجھے نہ اٹھانا -!

اجنبی:- (برافروختہ ہو کر) بیگم صاحب! میرے پاس تو ملک الموت
کا وارنٹ آیا ہے۔ یہ بل ایک سال سے ادا نہیں ہوا - اب
قرض خواہ میرے دروازے پر بیٹھے ہیں - اگر میں انہیں
روپیہ نہ دوں تو میری عزت میری دوکان، میری زندگی
بھر کی کمائی - سب کچھ ختم ہو جائے گا -!

بیگم:- (بے پرواہی سے) کتنی رقم ہے -؟

اجنبی:- جی! سات ہزار چھپن روپے! انہوں نے مجھ سے
ایک ہزار ساڑھیاں خریدی تھیں -؟

بیگم:- (صدمے کے عالم میں) ایک ہزار ...... ساڑھیاں ؟

اجنبی:- جی ہاں! مہاجرین کے لئے !

بیگم:- اچھا! دیکھئے - میں تو مخرب اخلاق فلموں کو بند کرانے
کے سلسلے میں ایک پکچر دیکھنے جارہی ہوں - میں ان کے
نام ایک خط لکھ کر رکھ جاتی ہوں جب وہ اٹھیں گے تو
خود ہی ....

اجنبی:- مگر مجھے تو ابھی ابھی ادائیگی کرنی ہے! میں اتنا

انتظار نہیں کر سکتا!

بیگم:۔ (غصے سے) آپ جانتے ہیں ان چیتھڑوں نے جنہیں آپ اردو اخبارات کہتے ہیں۔ مسٹر بدلشی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ انھیں بدنام کرنے کے لئے کیا کیا حربے استعمال کئے ہیں۔؟

جنبی:۔ مگر مجھے ان باتوں سے کیا تعلق۔؟

بیگم:۔ (زور سے) آپ اخبار پڑھتے ہیں۔؟

اجنبی:۔ جی ہاں پڑھتا تو ہوں مگر۔

بیگم:۔ اور پھر بھی آپ اگر مگر کر رہے ہیں۔ آپ اردو اخبار نہ پڑھتے تو اخبار فروخت نہ ہوتے، اخبار فروخت نہ ہوتے تو ان اخباروں کی جان نکل جاتی۔ ان کی یہ ہمت نہ ہوتی اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ ان چیتھڑوں کو خرید کر ان کی ہمت افزائی فرما رہے ہیں۔ ان کی ہمت افزائی ۔۔ یعنی آپ مسٹر بدلشی کے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں؟

جنبی:۔ میں تو بل کی ادائیگی ۔۔۔۔۔

بیگم:۔ سب مسلمان ایک خدا اور پیغمبر کو مانتے ہیں اور سب بھائی بھائی ہیں۔

اجنبی:۔ درست فرمایا مگر بل ؟

بیگم:۔ (چیخ کر) الٰہی اس قوم کو کیا ہو گیا ہے۔ اس نے تیری تعلیم کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ انا اللہ مع الصابرین!

اور اللہ ساتھ ہے صبر کرنیوالوں کے۔ آپ کہتے ہیں کہ صبر نہیں ہوتا۔ ابھی ہمارے پاس روپیہ نہیں ہے ۔۔۔۔

اجنبی:۔ (بات کاٹ کر) تو چیک ہی دیدیجئے !

بیگم:۔ لاحول ولاقوۃ۔ عرض تو کر دیا کہ روپیہ نہیں ہے۔

اجنبی:۔ میں یہ کب کہتا ہوں کہ آپ اپنی جیب سے ادا کر دیں اس سلسلے میں تو عوام نے دل کھول کر چندہ دیا تھا اس رقم سے ادائیگی کر دیجئے۔

بیگم:۔ آپ کو اس قسم کے مشورے دینے کا کیا حق ہے ؟

اجنبی:۔ معاف کیجئے۔۔۔ لیکن دیکھئے نا ۔۔۔۔

بیگم:۔ (اجنبی کی طرف بڑھتے ہوئے) یہ ہیں پاکستان کے پرستار! دوسروں کے گھروں میں بلا اجازت داخل ہو کر عورتوں سے بدتمیزی کرنیوالے۔ تمھیں شرم نہیں آتی۔!

(اجنبی بڑبڑاتا ہوا تیزی سے باہر نکل جاتا ہے)

بدیشی :۔ (کمبل منھ سے ہٹا کر) زندہ باد! بیگم زندہ باد! واہ واہ
سبحان اللہ! اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

بیگم :۔ (ہنس کر) زورِ قلم یا زورِ زبان! اخبار تمہاری نا اہلی کا
ٹھیک ماتم کرتے ہیں۔

بدیشی :۔ نا اہلی کا ۔؟ ـــــ لیڈر کے لئے صحیح الفاظ نہیں، بلکہ
صحیح خیالات پیش کرنا ضروری ہوتا ہے ۔ (جوش سے)
دیکھو بیگم! کتابیں پڑھ کے کوئی لیڈر نہیں بنتا۔ لیڈری پیغمبری
کی طرح ودیعت ہوتی ہے، عیسیٰ، موسیٰ، داؤد، یوسف
کسی نے بھی بی اے پاس نہیں کیا تھا۔ لیڈر کیلئے سیاست
کی مشینری میں سوجھ بوجھ لازمی ہے ـــــ اور سیاست
کی مشینری ۔

بیگم :۔ پیٹ کی مشینری کی طرح ہے ۔

بدیشی :۔ اونہوں! موٹر کی مشینری کی طرح ہے، وہی ہینڈل
گھمانا، وہی لبریکیشن، وہی کلچ دبانا ۔ وہی پہلا، دوسرا اور
تیسرا گیئر ۔!

بیگم :۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر موٹر ڈرائیور لیڈر بن
سکتا ہے ۔

بدیشی :۔ نہیں بلکہ موٹر ڈرائیور جو اچھا کلینر ہو اور اچھا
میکینک بھی ہو!

بیگم :۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔

بدیشی :۔ (خوش ہو کر) موٹر نے انسان کو ہاتھوں اور پیروں دونوں
سے کام لینا سکھایا۔ پہلے زمانے کے لوگ صرف ہاتھوں سے کام
لیتے تھے تو امیر علی ٹھگ مشہور ہو جاتے تھے۔ آج ہاتھوں
اور پیروں سے کام لیکر لیڈر بن جاتے ہیں۔ ہاتھوں سے
اسٹیرنگ گھماؤ اور پیروں سے کلچ دباؤ ـــ اور پھر اللہ تمہارا
حامی و ناصر ہے ۔ قدرت خود بخود سائڈ دیگی ۔! ۸۰ کی
رفتار سے چلو ۔ آج صدر کل سفیر، پرسوں وزیر، مختصر
یہ کہ دیکھتے ہی دیکھتے امیر ابن امیر !

بیگم :۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر اس وقت کی پریشانی کا حل کیا ہے۔
کمبخت کوئی لائسنس والا بھی تو نہیں مرتا۔ جو بیس پچیس ہزار
بن جاتے۔

بدیشی :۔ سیزن جو نہیں ہے ـــــ اب کے تو میں نے پلان
بنا رکھا ہے۔!

بیگم :۔ کیسا پلان ـــ؟

بدنیشی:۔ دو تین لاکھ پر ہاتھ ماروں، اور دو تین اخبار نکال
ڈالوں پھر دیکھنا ......

(دروازے پر زور سے دستک ۔ بدنیشی تیزی سے پلنگ کے
نیچے چھپ جاتا ہے)

بدنیشی:۔ بیگم خدا اس مردود کو بھی ٹالنا ۔!

بیگم:۔ بھئی یہ اچھی مصیبت ہے! اس طرح میرا دماغ تو خالی
ہو جائے گا ۔!

بدنیشی:۔ (کھسیانی ہنسی سے) بس یہی چاہیئے ۔ ہماری قوم کو
کٹھ پتلیوں کی ضرورت ہے ۔

(دستک کی آواز دوبارہ آتی ہے ۔ بیگم بیدلی سے دروازہ
کھولتی ہے ۔ ڈاکیہ ایک لفافہ دیتا ہے ۔)

بیگم:۔ قرض خواہ نہیں خط آیا ہے ۔!

بدنیشی:۔ (گھبرا کر) کیا ۔؟ خط؟ بس خط ہی آیا ہے ۔ اور تو کچھ نہیں
آیا ۔۔۔؟

بیگم:۔ (لفافہ پھاڑ کر پڑھتی ہے ۔)

محترم و مکرم! السلام علیکم، ہم نے آپ کی خدمت میں ایک
شخص کو روانہ کیا ہے جو کل شام آپ کے دولت کدے پر پہنچے گا۔

یہ خانصاحب کا خاص آدمی ہے ۔ یہ اپنے ساتھ روپے
لیکر آئے گا ۔ اگر جناب کو کم معلوم ہوں تو زیادہ روپیہ بھی
روانہ کر دیا جائے گا ۔ (رک کر) آہ روپیہ آگیا!

بدنیشی:۔ (دوڑ کر خط چھین لیتا ہے اور پڑھتا ہے) آپ کی قومی
خدمات کی ہر طرف دھاک ہے اب آپ اپنے اثر اور اس
روپے کی مدد سے کام لیجئے اور جب آپ صدر بنیں تو ہم دونوں
میں سے کسی ایک کو سکرٹری بنوا دیجئے ۔"

بیگم:۔ (بدنیشی کا ہاتھ کھینچ کر) یہ تو کوئی بڑی بات نہیں، مبارک ہو!

بدنیشی:۔ (خوش ہو کر) آپ کو بھی سلامت!

بیگم:۔ میرے دل میں عرصے سے ایک حسرت ہے ۔ میں چاہتی
ہوں تمہارے لئے باقر جیسی ایک کار خریدوں ۔! (شرماتی ہے)

بدنیشی:۔ میں بھی تمہارے لئے ایک کار خریدوں گا ۔

بیگم:۔ کیا ضرورت ہے ایک نئی کار کافی نہیں! (ساحرانہ انداز
سے مسکراتی ہے ۔)

بدنیشی:۔ آج ایک ہفتہ ہو گیا نہ ہم بازار گئے اور نہ کچھ خریدا ۔!

بیگم:۔ (خط سے کھیلتے ہوئے) ہمارے پاس سب کچھ ہے مگر گلشن پر
ایک بنگلہ نہیں ۔! تم مہاجرین کو بساتے پھرتے ہو اور اپنے

لئے مکانات بنوانے کا تمہیں ہوش نہیں۔ ارے! (زور سے
چیخ مارتی ہے)

بدیشی:۔ (گھبرا کر) بیگم! بیگم کیا ہوا۔؟

بیگم:۔ (اپنے کو سنبھال کر خط آگے بڑھا دیتی ہے) آخری سطریں آخری سطریں!

بدیشی:۔ کیا ہے؟ کیا ہے؟ آخری سطروں میں (پڑھتا ہے) اور جب آپ صدر
بنیں تو ہم دونوں میں سے کسی ایک کو سکریٹری بنوا دیجئے۔ آپ کی خادمئیں
زہرہ جان اور منی جان۔

(بدیشی کی آنکھیں اُبلے ہوئے انڈے کی طرح باہر نکل آتی ہیں۔)

بدیشی:۔ ہوں! تو کسی صاحب نے ہم سے مذاق فرمایا ہے ایسی نابکار قوم
ہے یہ! جس نے مولانا محمد علی جیسے مخلص کو مولانا چندہ کہا۔ جس نے
قائد اعظم کے اسلام پر شک کیا وہ بھلا ایم طے بدیشی کی قدر کیا جانے!
ذلیل، کمینے، مردود۔

بیگم:۔ (روتی آواز سے) ان اللّٰہ مع الصابرین۔ اور ساتھ ہے
اللہ صبر کرنیوالوں کے۔!

بدیشی:۔ چپ رہو! یہ صرف عوام کے لئے ہے۔

(پیر پٹختا باہر چلا جاتا ہے۔)

ایک حمام میں

میں کراچی کب آیا ــــ یہ تو مجھے یاد نہیں ہاں اتنا یاد ہے کہ جب میں نے اس عروس البلاد میں قدم رکھا تو میرے ساتھ بہت سی گٹھریاں تھیں۔ میں یہ گٹھریاں اٹھائے مکان کی تلاش میں سڑکوں پر گھومتا رہا۔ مکانوں کے نقشے ــــ چند منٹ کے لئے ابھرتے اور پھر تارکول کی سیاہ سڑکوں میں گم ہو جاتے کیونکہ مکانوں کے کرایوں کا تعین، گنجائش اور آسائش کے مدنظر نہیں بلکہ مالک مکان کی چاؤ

کے مطابق تھا۔ میں نے اپنی قابلیت کا پوری فراخدلی سے اندازہ لگا کر اپنی آئندہ
آمدنی کا تخمینہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں اس قدر شاندار کامیابی کے باوجود ان
میں سے کسی مکان کو "فل ٹائم" استعمال کرنے کے قابل نہ ہو سکوں گا۔ غرضیکہ کراچی
کی تمام سڑکوں پر میں نے بسوں سے زیادہ چکر کاٹے ——
کہیں کہیں "کرایہ پر خالی ہے" کی تختی میرے لئے چوراہے کا لال سگنل بن
جاتی —— لیکن مالک مکان کے "شروع کے بول" ہی وہ
سماں باندھتے کہ میرا رنگ زرد اور سگنل کا سبز ہو جاتا۔ سڑکوں کا طول
اور میری داڑھی بڑھتی رہی لیکن گٹھریاں کم ہوتی رہیں۔ آخر وہ دن بھی
آیا جبکہ میرے پاس ایک بھی گٹھری نہ رہی اور میں پوری فراغت
سے ہلکا پھلکا ہو کر چہل قدمی کرنے لگا۔ یہ شام میرے لئے قیام کا پیغام
لائی۔ ایک نوجوان جو ایک حلوائی کی دکان پر کھڑا تھا مجھے اس
انہماک سے دیکھنے لگا کہ میں خود ٹھٹک کر رہ گیا۔ جب اس کی یاد کے
کھوئے ہوئے سرے مل گئے تو وہ ہنستا ہوا آگے بڑھا اور مجھ سے
بے اختیارانہ لپٹ گیا۔

یہ میرا بچپن کا ساتھی —— خالد تھا جو کھیل میں میرے
ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا اور اسکول میں روزانہ جماعت سے
باہر میرے فراق میں تڑپتا رہتا۔ اس کی شرارتوں سے سب استاد

پناہ مانگتے تھے اور اس غریب کو جماعت سے باہر کر دیتے تھے خالد
نے میری مصیبت پر پرسہ دیا اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی
خالد کا مکان —— صرف ایک کمرے اور ایک چھوٹے سے
ورانڈے کا عرف عام تھا اور اب آبادی بڑھ جانے کے بعد لقب سمجھا
جانے لگا تھا۔ اس مکان میں اب خالد، اس کی بیوی، اس خاکسار
اور خالد کے آئندہ بچے کا اثر تھا۔

خالد کے مکان میں میرے قیام کو ابھی ایک ہفتہ بھی
نہ گزرا تھا کہ مسز خالد کی طبیعت بادلوں کی تیزی اختیار کرنے
لگی۔ اور کراچی کے آسمان پر بھی نیلے نیلے بادل امنڈنے لگے ٹھنڈی
ہواؤں کے چکارے دلوں کو تھپکیاں دینے لگے۔ بیگم خالد میں
بیزاری اور خالد میں موسیقی بیدار ہونے لگی۔ بیگم خالد بڑبڑانے
لگیں، اور خالد گنگنانے لگے۔ بیگم خالد کے تیور میری روح
کو سرد کر دیتے تو خالد وائلن اٹھا لیتا۔ پھر فضا میں نغموں کا
طوفان ہوتا جس میں میری روح غسل کرتی اور نئے ظلم سہنے کے لئے
تیار ہو جاتی۔ ایک شام میں گھر پہنچا تو خالد اور بیگم خالد
میں دھیما مباحثہ جاری تھا۔ میری آمد سے دونوں نادم سے
ہو گئے اور خاموشی طاری ہو گئی، اتنے میں بادل بہت زور سے

گرجے اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ خالد کی بیوی لپک کر
باہر پھیلی ہوئی چیزیں سمیٹنے لگی اور خالد موسم پر تبصرہ کرنے
لگے۔ بوندیوں کا جلترنگ بڑھ کر دسہرے کے باجوں کے شور میں
تبدیل ہو گیا۔ میں اتنے حسین موسم کو لحاف میں گذارتا ہوں،
جیسے جیسے موسم کی کافر ادائیاں بڑھتی گئیں ویسے ویسے میرا
لحاف بھی سرکتا گیا۔ ابھی گھٹنوں تک، ابھی کمر تک اور پھر سینے
تک آ گیا۔ بوچھاڑ کی دراندازی بڑھی تو میں لحاف کے پُرسکون
اندھیرے میں گم ہو گیا۔

"خالد! کس غضب کا موسم ہے آج" میں نے لحاف کے اندر
سے چیخ کر کہا۔

"جی ہاں"

"جھولا کن ڈالوری امریاں" میں نے اندر پڑے پڑے گانا
شروع کر دیا۔ میں نے سوچا کہ یہ کب تک چپ رہیں گے،
کبھی نہ کبھی تو موڈ میں آئیں گے۔ پھر خالد وائلن بجائے گا،
بھابی مٹکے پر تال دیں گی اور بندہ میگھ ملہار گائے گا۔

"اب چپ بھی رہو گے یا نہیں" خالد کی آواز گونجی۔

"ارے میاں! اگر پسند نہیں آرہا تو خود گا کر سنا دو!"

خالد نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"یار خالد" میں نے کہا، "عجیب بدمذاق آدمی ہو، اس حسین
موسم میں مٹی کے مادھو بنے بیٹھے ہو!"

"تمہارے دماغ پر موسم نے غلط اثر کیا ہے" خالد نے جھلا کر
کہا۔ میں نے تعجب سے منہ لحاف سے باہر نکالا۔

"کیوں خیریت تو ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ دیکھ رہے ہو" خالد نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ! یہ چھاج کیوں اوڑھ رکھا ہے۔ ارے چھت کہاں گئی؟"

خالد چھاج اوڑھے بیٹھے تھے اور اس چھاج پر پرنالوں
سے باجا سا بج رہا تھا۔ چھت میں کوئی ایسا مقام نہ تھا جو خشک
علاقے سے تعبیر کیا جائے۔

"میاں لحاف سے باہر نکلو تو پتہ چلے" خالد نے میری
حیرانی پر طنز کیا۔ میں نے لحاف سے سر نکالا۔ میں خود پانی کے ایک
سمندر میں چھوٹا سا ٹاپو بنا ہوا تھا۔

"اور بھابی کہاں ہیں؟" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

خالد نے منہ سے کچھ نہیں کہا البتہ ایک ڈھیر کی طرف انگلی سے
اشارہ کر دیا۔

"بھئی وہاں تو پڑوسیوں کی بوریاں پڑی ہیں"!

"وہ وہیں ہیں ـــــ" خالد نے کہا

"بوریوں کے نیچے"؟

"ہاں! کپڑے بھیگ گئے تھے اس لئے وہ بوریوں میں دبکی ہوئی ہیں"

قدرت کے بادل چھٹے تو بے سروسامانی کے بادل چھا گئے ـــــ اور مجھے محسوس ہوا کہ سانجھے کے مکان سے ساجھے کی قبر بہتر ہے۔

پھر ایک اور شام میرے لئے قیام کا پیغام لائی اور امام سے ملاقات ہوئی۔ آپ ایک بلڈنگ سے اترے اور فرمانے لگے۔

"السلام علیکم! آپ کا اسم گرامی؟"

"بندے کو مقتدی خان کہتے ہیں۔ اور جناب والا کو؟" میں نے عرض کیا۔

"امام!" بہت مسکرا کر فرمایا۔

"کسی مسجد سے تعلق ہے جناب کو؟"

"مسجد سے تو نہیں" ہنس کے فرمایا۔ "دین سے ہے ـــ مجھے امام الدین کہتے ہیں۔"

"کیوں جناب امام الدین صاحب۔ یہاں رہنے کے لئے بھئی میرا مطلب ہے سر چھپانے کی بھی کوئی جگہ ہے۔"

"ہاں ہے تو سہی!" کچھ متفکر ہو کر فرمایا "لیکن شاید آپ قدرے دقت محسوس کریں"

"ابھی نہیں" میں نے جوش سے عرض کیا "دقت بہرحال مصیبت سے کم ہے۔ کہاں ہے وہ جگہ؟"

"ہماری بلڈنگ کا غسل خانہ کافی کشادہ ہے اگر آپ اس میں رہ سکیں تو میں انتظام کر سکتا ہوں کیونکہ وہ میرے قبضے میں ہے جگہ بے حد صاف ستھری ہے اور پانی تو ہر وقت مل سکتا ہے۔ اندر حوض بھی ہے جو شفاف پانی سے بھرا رہتا ہے۔ اگر جناب کو تیراکی وغیرہ کا شوق ہو تو وہ بھی پورا ہو سکتا ہے۔"

"میرے عزیز دوست" میں نے کہا "خاکسار خشکی کا جانور ہے۔ خیر۔ کرایہ کیا ہوگا؟"

"کرایہ دس روپے مہینہ"

"لیکن قبلہ عالم! وہاں نمی بھی ہوگی۔ ہر وقت نزلے کھانسی بلکہ ڈاکٹر کا ڈر رہے گا۔ اس لئے کرایہ میں کچھ کمی......؟"

"بھائی" امام الدین نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

اور آپ یہ بھی تو سوچئے کہ اس غسل خانے میں ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی اپنا صابن بھول جاتا ہے۔ آجکل ایک صابن کی ٹکیہ روپیہ بارہ آنے سے کم کی نہیں ملتی۔ آخر یہ صابن بھی تو آپ کو ہی ملے گا۔ کرایہ تو صابنوں سے وصول ہو جائے گا۔ ویسے میں کرائے میں کوئی کمی کر بھی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ اس کرایہ میں تمام بلڈنگ والوں کی شرکت ہے اور ۱۵۰ سے کم پر راضی نہیں ہوں گے“۔

”اچھا خیر!“ میں نے دل کڑا کر کے کہا ”اب اور ہو بھی کیا سکتا ہے“ اور جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر دین کے اس امام کو نذر گذارنی۔ وہ مسکرایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگا۔

”برادر عزیز!“ اس نے کہا ”غسل خانے کا نل اس قدر اونچا ہے کہ خالی وقت میں اس میں جھولا بھی ڈالا جا سکتا ہے۔ اور نل کھول کر ساون کا پورا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔“ ”خیر“ میں نے عرض کیا۔ ”ساون کی تو فرصت کی بات ہے۔ میں کئی راتوں سے سویا نہیں ہوں۔ اور آرام کے لئے ترس گیا ہوں۔“ بہر طور وہ غسل خانہ میرا دولت کدہ بن گیا۔ غسل خانہ واقعی کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ جگہ کافی شاندار تھی۔ لیکن یہاں صرف کھڑے کھڑے ان خوبیوں سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ بیٹھنے کا سوال

نہ تھا۔ اس لئے کہ فرش ہر وقت گیلا رہتا تھا۔ حوض کے کنارے ہر وقت پھسلواں تھے کہ وہاں بیٹھنا یا غوطہ کھانا برابر تھا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ نل کی ٹونٹی لمبی تھی اور اس پر دیوار کے سہارے تکیہ رکھ کر اور ٹونٹی کو گھوڑا بنا کر بیٹھا جا سکتا تھا۔ مگر اس میں بھی ڈاکٹر کا خطرہ تھا۔ میرے مہربان دوستو! میں نے بیس روپے اور خرچ کئے اور نل کی ٹونٹی کے پچھلے حصے پر لکڑی کے تختے لگوائے اس طرح میرے لئے ایک تخت تیار ہو گیا۔ اس کے ایک مہینہ بعد میری شادی ہو گئی۔ میری بیوی نے جب میرا مکان دیکھا تو گھبرائیں لیکن رفتہ رفتہ غسل خانے سے مانوس ہو گئیں، آخرکار وہ خود دلاسہ دینے لگیں ”مکان نہیں تو کیا ہوا۔ شریف لوگ تو غسل خانے میں بھی رہ سکتے ہیں کیوں نہ ہم یہاں ایک پارٹیشن لگا لیں۔“

”پارٹیشن؟“ میں نے گھبرا کر کہا، ”بیگم صاحبہ اس بلڈنگ کے رہنے والے تو حد درجہ بے ایمان ہیں۔ وہ ہمارے تخت طاؤس پہ اعتراض کرتے ہیں تو بھلا دیوان خاص بنانے کی اجازت کس طرح دیں گے۔ لہٰذا بیگم صاحبہ دیوان عام میں دربار کرنے پر ہی اکتفا فرمایئے ...“

دن گذرتے گئے اور ہم زندگی کی پھسلواں اور غسلخانے

کے چھپاکوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ ابھی ایک سال بھی نہ گذرا
تھا کہ خدا نے ہمیں ایک چاند سا بیٹا عنایت فرمایا۔ بیگم صاحبہ نے
پاکستان کی مناسبت سے اس کا نام پاکستانی رکھنا چاہا۔ مگر میں
نے مکان نہ ہونے کی بنا پر "لامکانی" تجویز کیا۔ اور اسی نام سے وہ
بندۂ خدا بلڈنگ کے خاص و عام میں مشہور ہو گیا۔ ہم اس حوض
میں بھی غوطے کھاتے رہے اپنے بچے کو نہلاتے بھی رہے اور حالات
کا مقابلہ بھی کرتے رہے۔ یہاں ہمیں ایک
تکلیف تھی اور وہ یہ کہ بلڈنگ کے رہنے والے شام کو اپنے اپنے
تولیوں سے آراستہ اور صابن دانیوں سے مسلح نہانے کے لئے آتے
ایک تانتا لگ جاتا اور وہ شور و غل ہوتا کہ کان پڑی آواز سنائی
نہ دیتی اس موقع پر بیوی جب بھی کچھ کہتیں تو مجھے ان کے ہونٹ
ہلتے ہوئے نظر آتے اور پلے بیک سنائی نہ دیتا جب میں تھک گیا
تو میں نے ایک ایک غسلچی کی خوشامد کی اور کہا "اے مسلمان بھائیو!
خدا کے لئے صرف جمعہ کے دن نہایا کرو۔ یہ روزانہ نہانے سے کیا
فائدہ! آخر ہم بھی ہیں۔ دنوں نہیں نہاتے حالانکہ غسل خانے میں
رہتے ہیں۔ کچھ ہمارا بھی تو خیال کرو۔ اس بلڈنگ میں تئیس آدمی
تھے۔ اور وہ سب کے سب میری باتوں پر اندر ہی اندر کھولتے

اور کبھی کبھی غصے میں آ کر میرا ڈونگا بھی پھینک دیتے۔ بیگن جناب میرا
ڈونگا۔ پرانے زمانے کے جست کا بنا ہوا تھا۔ ایسی اٹھا پٹخ کو گردانتا
بھی نہ تھا۔ ہمیں ان کی تنگدلی پر تاؤ تو آتا تھا۔ لیکن کسی نے سچ کہا
ہے کہ مجبوری کا دوسرا نام صبر ہے۔ کچھ دنوں بعد میری ساس صاحبہ
شکارپور سے تشریف لائیں اور انھوں نے بھی اس غسلخانے میں
حوض کے کنارے بستر لگا دیا۔ کہنے لگیں۔ اے ہے ننھے کو دیکھنے کے
لئے میری جان کس قدر بے چین تھی۔ جی چاہتا تھا۔ پر لگ جائیں
اور اڑ کر جاؤں اور اپنے نواسے کو گود میں لیکر بیٹھوں۔ شکر ہے
اس پاک پروردگار کا کہ اس نے آج یہ دن دکھایا"
"میں نے ادب سے عرض کیا" اماں جان آپ بڑی خوشی
سے اپنے نواسے کو گودی میں لے کر بیٹھئے بلکہ جی چاہے تو حوض کے
کے بیچوں بیچ تشریف رکھیئے۔ خدا نے خوب کیا کہ آپ کو یہ دن
بھی دکھایا۔ اس کے بعد میں نے بیگم سے کہا۔
بیگم سیا بچے کو دیکھنے کے لئے غالباً اور رشتہ دار بھی بیچین
ہوں گے۔ وہ بھی آتے ہی ہوں گے۔ مجھے صاف صاف بتا دو؛
غلط فہمی میں نہ رکھو۔!
بیگم ہنس کر کہنے لگیں۔ اب اور کون آئے گا۔ شاید عید

کی چھٹیوں میں بھائی جان آجائیں۔ چھوٹی خالہ اور بڑی ممانی
شاید نہ آئیں۔ پھوپی اماں چچی دلہن کو کبھی فرصت ہوئی تو۔۔۔۔
۔۔۔۔۔"

میں بیگم کے رشتہ داروں سے نیاز حاصل کئے بغیر باہر
نکل آیا۔ ایک لفافہ پر بیگم کا نام لکھ کر اور اس میں اپنی تمام پونجی
رکھ کر چلا آیا ہوں۔ اللہ میرا حامی و ناصر ہے۔!

چلتی ہوئی باتیں

ہمارا ملک — زرعی اور ادبی ملک ہے زراعت کی ترقی کے لیے تو امریکن کھاد
اور فنی امداد مل رہی ہے لیکن ادبی ترقی کے لئے وہی سو سال پرانی "انگریزی کھاد" استعمال
ہوتی ہے جس میں اتنی بھی توانائی نہیں کہ قلمی پیدا ہو سکیں۔ ہے نیم کے درخت تو وہ خود رو
ہوتے ہیں جب شعر مدرسے میں اور تیر شہر میں پہنچ جاتا ہے تو صورت حال بدل جاتی ہے لیے
نازک موقعوں پر کیا رہنمائی ہو سکتی ہے۔ مغرب کی تجارتیت نے مشرق کے موقع پرستوں کے
لیے نئی راہیں کھول دیں۔ نیم اور کیکر کے درخت جا بجا پیدا ہونے لگے۔ چار و ناچار لوگوں
نے انہی کے سائے میں پناہ لی۔ نیم کی تلخی اور کیکر کی سوزش سب کو محسوس ہوتی ہے۔ لیکن کچھ لوگ
ان سے بے پرواہ ہاکس بے کی سیر میں وقت صرف کرتے ہیں۔ کم وسیلہ پناہ کی آمادگی پیدا کرنے
کے لئے زندگی خرچ کرتے ہیں۔ ہمارے ادب کی سنگلاخ زمینوں پر نفرت کی تپش نے زندگی کے
لطیف رُخ کو مرجھا دیا ہے۔ ایک ادیب نے خوب کہا تھا! لوگوں سے نفرت کرنا ایسا ہے
جیسے کسی چوہے کو مارنے کے لئے اپنے گھر میں آگ لگا لینا ہے

شکست کے اندیشوں سے اُبھرے ہوئے نفرت کے جذبے اور بچگانہ اقسام پسندی نے ہمارے ادب کو کھردرا اور نکیلا بنا دیا ہے۔ نفرت عقل کے بڑے بڑے دوستوں کو بھی اندھا کر دیتی ہے کمال کے پرستاروں نے سقراط کو زہر کے پیالے کا اور مسیح کو صلیب کا انعام دیا تھا اور پھر صدیوں تک اس کا ماتم کرتا رہے ــــ دوسرا رخ ــ ہمارا ادب یورپ کی نصف خیالی کا پرتو بنتا جا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ "بنا سپتی" اور "اصلی گھی" کی شناخت کے لئے وقت کی ضرورت ہو گئی ہے۔ قوم کے پاس وقت نہیں ـ اس لئے وہ کتابیں پڑھنے کے بجائے فلمیں دیکھنے لگی ہے جب ان ادیبوں کو معلوم ہوگا کہ ان کا لکھا کوئی نہیں پڑھتا تو یہ فلموں میں کام کرنے لگیں گے۔ لیکن اس وقت ٹیلی ویژن آچکا ہوگا اور قوم ٹیلی ویژن دیکھ رہی ہوگی ـ ادب کے یہ خلائی انسان خود کار ترغیبوں کے اشارے پر سرگرداں ہیں۔ ذاتی تحفظ کے جنون میں ان کی قلم بندوق بن گئی ہے اور درندوں، چرندوں اور پرندوں کی تمیز اٹھ گئی ہے۔

آج کل جس طرح ملکی معیشت کی ترقی کے لئے تیل نکالنا ضروری ہو گیا ہے اسی طرح خاندانی سربلندی کے لئے اولاد میں سے ادیب و شاعر نکالنا لازمی ہو گیا ہے۔

ایک دن ایک صاحب چار لڑکیوں اور تین لڑکوں کا رسالہ لے کر ایک رسالے کے ایڈیٹر سے ملنے آئے ـ ایڈیٹر صاحب کاغذات کے انبار میں کھوئے ہوئے تھے۔ لیکن سات جیتے جاگتے انسان "ورائٹی اینڈ رول" کی ترنگ میں شور مچاتے کمرے میں داخل ہوئے تو ان کی آنکھ کھل گئی۔

ملاقاتی :۔ (جھک کر) السلام علیکم ایڈیٹر صاحب

ایڈیٹر : (گھبرا کر) فرمایئے!

ملاقاتی :۔ (مسکرا کر) یہ میری لڑکیاں ہیں۔ باری باری آؤ بٹیا! یہ رشیدہ ہے، یہ ثمینہ ہے، یہ حسینہ ہے اور یہ نگینہ! یہ لڑکے ہیں یہ ابھار ہے، یہ اسرار ہے، یہ انوار ہے!

ایڈیٹر :۔ (سوالیہ انداز میں) جی؟

ملاقاتی :۔ (کاغذوں کا پلندہ دیتے ہوئے) یہ ان کے مضامین ہیں۔ انھیں جلد شائع فرما دیں۔

ایڈیٹر :۔ (عینک نیچے رکھتے ہوئے، حیرت سے) یہ سب مضمون نگار ہیں۔

ملاقاتی :۔ (ایڈیٹر کی ناواقفیت سے گھبرا کر) ابھی یہ کہاں مضمون نگار ہیں یہ تو بچے ہیں۔

ایڈیٹر :۔ (ایڈیٹر بچوں کے بگڑنے کے خوفناک جذبے سے قلم اٹھا کر) کیا فرمایا؟

ملاقاتی :۔ حضور والا! فی الحال سب مضمون ان کی والدہ کی گفتگو کے خلاصے اور میری تفصیلی تحریر پر مشتمل ہیں۔

ایڈیٹر :۔ (بے ہوشی کے عالم میں) سب آپ لکھ کر لائے ہیں۔ اچھا خیر دیکھوں گا!

ملاقاتی :۔ جناب! ابھی دیکھ لیں اور اگلے شمارے میں شائع کر دیں۔

ایڈیٹر :۔ (سر ہلا کر) ناممکن! ناممکن!

ملاقاتی :۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔

ایڈیٹر :۔ (مدیرانہ سختی سے) اس شمارے میں تو بالکل جگہ نہیں ہے۔

ملاقاتی :۔ لیکن دیکھیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔

ایڈیٹر :۔ (حیرانی سے) کیسی مشکل؟

ملاقاتی :۔ اگلے مہینے انڈیا سے کچھ رشتہ دار آنے والے ہیں۔

ایڈیٹر :۔ (بے پھدائی سے) تو آنے دیجیے!

ملاقات؍ ادا جزی سے، انھیں یہ چھپے ہوئے مضمون دکھاتے ہیں

ادب عہد طفلی میں شاعری تک محدود تھا اور اس وقت بھی شاعری کرنے پیغمبروں کی صفات سے متصف ہونا لازم گردانا جاتا تھا یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ کشمیری زعفران مشکل سے ملتی تھی اب تو ہر پنساری کی دکان پر کشمیری زعفران مل جاتی ہے اسی لئے ہر گلی کوچے میں تعلیم یافتہ پلٹنوں کے حساب سے دستیاب ہوتے ہیں اس روشن زمانے میں ادیب یا شاعر کے لئے جو شرائط ہوں گی وہ اگلے زمانے سے کہیں سخت ہوں گی۔

مجھے مشہور فلسفی شاپن ہار کا ایک واقعہ یاد آگیا وہ اکثر طعام خانے میں رات کا کھانا کھانے جاتا میز پر بیٹھتے ہی جیب سے ایک اشرفی نکال کر میز پر رکھ دیتا اور خاموشی سے کھانا کھاتا رہتا کھانا ختم ہونے کے بعد اشرفی اٹھا کر جیب میں ڈال لیتا۔ ایک دن جب وہ کھانا کھا چکا اور اپنی رسم کے مطابق اشرفی جیب میں ڈال لی تو ایک صاحب اس کے پاس آئے اور اس گتھی کو سلجھانا چاہا شاپن ہار نے کہا ۔ ”جس دن میری قوم کے افراد عورتوں اور کتوں کے متعلق باتیں کرنی چھوڑ دیں گے۔ اس دن یہ اشرفی میں کسی محتاج خانے کو دیدوں گا۔“

شاپن ہار کو یہ شکایت عوام سے تھی۔ اور کچھ ایسی ہی شکایتیں خواص سے کر رہا ہوں۔

ادب کا یہ نومولود — والدین کی نگرانی کے بجائے آیاؤں کی آغوش میں پل کر جوان ہوا تو ۔ ؎

پروانے کا حال اس محفل میں ہے قابل دید اے اہل نظر
ایک ہی شب پیدا بھی ہوا، عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا